پیپل والی گلی

اے حمید

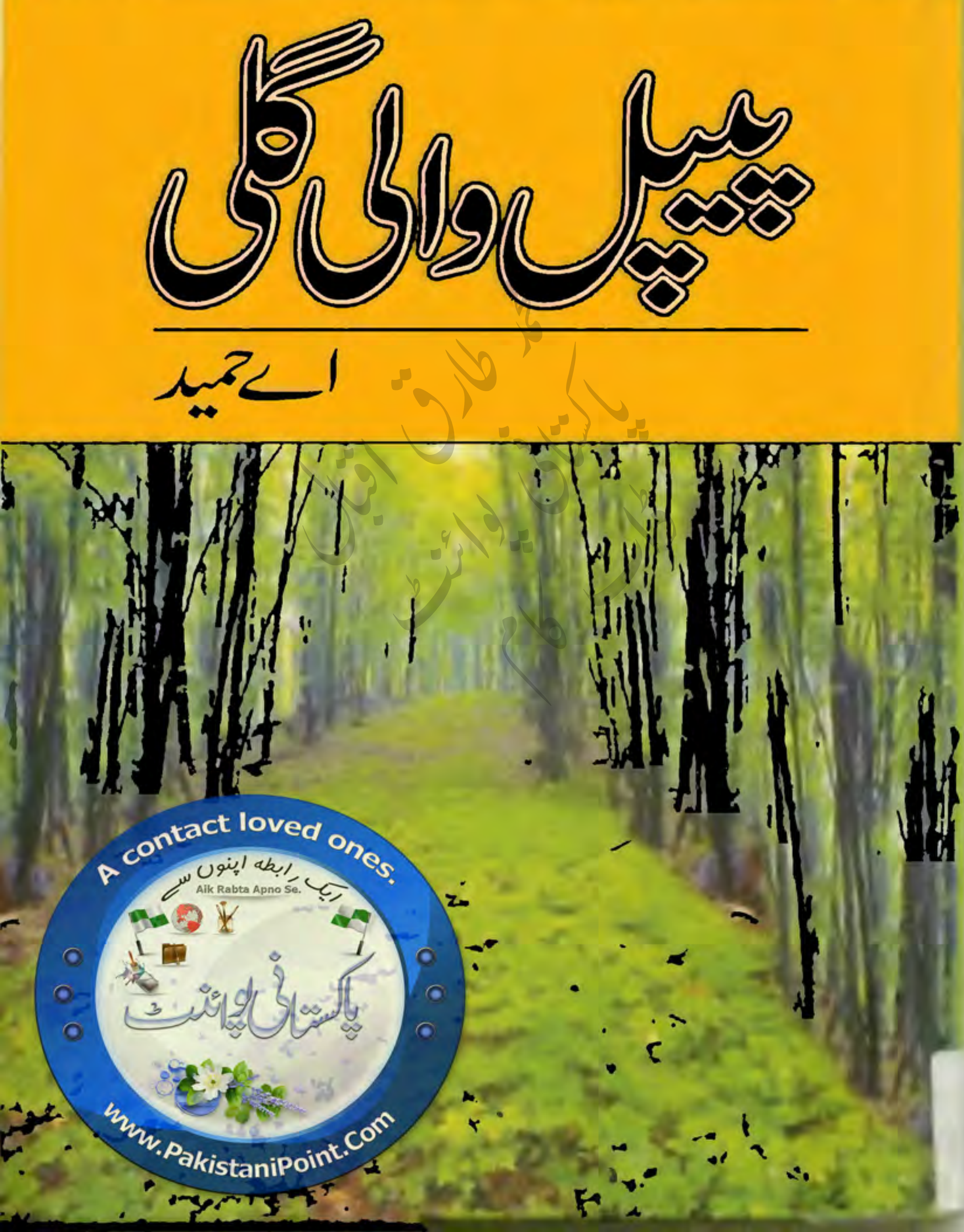

A contact loved ones.
ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.
پاکستانی پوائنٹ
www.PakistaniPoint.Com

محمد طارق اقبال
پاکستانی ڈائجسٹ
ڈاٹ کام

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

محمد طارق اقبال
پاکستانی ڈائجسٹ
ڈاٹ کام

محمد طارق اقبال
پاکستانی ڈائجسٹ
ڈاٹ کام

امرتسر سے ہماری تیرہ لاریوں کا قافلہ سرگودھا روانہ ہو گیا۔

دوسری جنگ عظیم زوروں پر تھی۔ جاپان نے بھی اعلان جنگ کر رکھا تھا۔ اتحادیوں کو سرگودھا کے نزدیک ایک ہوائی اڈا بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ امرتسر کی ایک ٹرانسپورٹ کمپنی نے زیر تعمیر ہوائی اڈے تک سرگودھا شہر سے روڑی اور بجری لاریوں میں لاد کر پہنچانے کا ٹھیکہ لے لیا۔ اس مقصد کے لئے کمپنی نے تیرہ لاریوں کا انتخاب کیا ان میں کچھ لاریاں بہتر حالت میں تھیں اور کچھ بالکل چھکڑا ہو رہی تھیں۔ یہ پرانی وضع کی گاڑیاں تھیں، جن کے اندر بیٹھنے کی نشستیں آمنے سامنے ہوا کرتی تھیں۔ اب تو اس قسم کی لاریاں مفقود ہو چکی ہیں۔ کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر نے ان تمام لاریوں کی نشستیں نکلوا دیں اور ہر لاری کے پچھلے حصے کی دیوار بھی اکھڑوا دی۔ اور یوں انھیں ٹرکوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ کیونکہ صرف اسی صورت میں ان پر روڑی لاد کر سرگودھا شہر سے کوئی دس گیارہ میل کے فاصلہ پر ہوائی اڈے کے میدان میں پہنچائی جا سکتی تھی۔ میں ان دنوں اپنے پہلے عشق اور میٹرک کے امتحان سے فارغ ہوا ہی تھا۔ اور میرا کام کمپنی باغ میں گھوم پھر کر اپنی شادی شدہ محبوبہ اختر کو یاد کرنا اور اپنے دوستوں کے ساتھ کامریڈ ہوٹل میں بیٹھ کر بڑے رومانٹک موڈ میں دیوداس ایسا حلیہ بنا کر چائے پینا اور دوستوں کے چہروں کو ٹک ٹک دیکھنا تھا۔ قبلہ والد صاحب کو میرے مستقبل کا بڑا فکر تھا۔ ایک بار انھوں نے مجھے پہلوان بنانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ اکھاڑے میں ان کے ساتھ تین دن کی زور آزمائی کے بعد میں چارپائی پر پڑ گیا اور والد صاحب نے مالش کر کے میری چارپائی کے پاس ہی ڈیڑھ ہزار ڈنڈ لگانے کے بعد سر جھٹک کر کہا۔

''اس لڑکے نے میرے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا ہے''۔

دوسری مرتبہ انہوں نے مجھے ریلوے میں ٹی ٹی بنانے کی کوشش کی۔ کیونکہ والد صاحب نے دیکھا تھا۔ کہ جب ٹی ٹی ڈبے میں آتا ہے تو اس کی بڑی عزت ہوتی ہے۔ اور اس وقت وہ ریل کے ڈبے کا بادشاہ ہوتا ہے۔ نگھر نامی گوجر نے جوماناوالہ سے امرتسر دودھ لایا کرتا تھا ٹی ٹی کی ایک ٹوپی لا کر والد صاحب کو دی۔ اسے یہ ٹوپی ریلوے لائن کے پاس

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام
PAKISTANIPOINT
ایک رابطہ اپنوں سے

پڑی ہوئی ملی تھی۔ والد صاحب نے یہ ٹوپی میرے لئے سنبھال کر رکھ لی۔ اس خیال سے کہ جب میں ٹی ٹی بن جاؤں گا تو مجھے دے دی جائے گی۔ مگر ان کا یہ خواب بھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ بس ٹی ٹی بننے کی بجائے اختر کا عاشق بن گیا۔ اور جب وہ مجھ سے بچھڑ کر کسی دوسرے کے ساتھ دلہن بن کر چلی گئی تو دیوداس بن کر گلی کوچوں میں دوستوں کے ساتھ پھرنے لگا۔ اور دوسروں کو اپنی عاشقی سے مرعوب کرنے کے لئے یونہی وقت بے وقت ٹھنڈی آہیں بھرتا رہتا اور انھیں یوں مستی بھری نشیلی آنکھیں بنا کر دیکھتا جیسے وہ اختر کے رشتہ دار لگتے ہوں۔

والد صاحب کو میرے، معاشقے کا علم ہوا تو ایک دن مجھے بڑے رومانٹک موڈ میں گھر میں داخل ہوتا دیکھ کر پاؤں سے جوتا اتارا اور تڑاتڑ میرا سر کوٹنا شروع کر دیا۔ میں بھی کوئی نقلی عاشق نہیں تھا۔ جوتے کھائے جا رہا تھا اور زبان حق سے یہ شعر پڑھے جا رہا تھا۔

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

آج سے پندرہ سولہ سال پہلے جوتے اور سر دونوں بڑے مضبوط ہوا کرتے تھے چنانچہ نہ گھر قبلہ والد صاحب کا جوتا ٹوٹا اور نہ میرے سر پر اس کا کچھ اثر ہوا۔ جب انہوں نہ والدہ کے بیچ میں آ پڑنے سے ستم سے ہاتھ کھینچا تو ان کا جوتا اور میرا سر--------

دونوں اپنی اپنی جگہ پر قائم تھے۔

لیکن اس ٹھکائی کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ میں کچھ عرصہ کے لئے دیوداس کلرک بن گیا اور باٹا فیکٹری جلو میں ملازم ہو گیا۔

صبح امرتسر سے بابو ٹرین میں بیٹھ کر جلو جاتا اور شام کو اسی گاڑی میں بیٹھ کر واپس آ جاتا۔ ریلوے کے پاس کی جو رقم ملتی اسے کھا پی کر ہضم کر جاتا اور سفر بغیر ٹکٹ کے کرتا۔ ایک روز پکڑا گیا اور گوردسرستانی سٹیشن پر اتار دیا گیا۔ دن بھر کھیتوں میں گھوم پھر کر گاجریں مولیاں کھاتا اور بھینسوں کے آگے ڈالے ہوئے گنے اٹھا اٹھا کر چوستا رہا۔ شام کو دوسری گاڑی سے واپس گھر آ گیا۔ اب میں جلو فیکٹری کے پاس ہی ایک گاؤں کے کچے مکان میں امرتسر کے کچھ ساتھیوں کے ساتھ رہنے لگا۔ ہم مٹی کی ہانڈی میں خالص دودھ ابالتے ۔مٹی کے کٹوروں کے ساتھ منہ لگا کر اس کو چڑھا جاتے۔ رات کو گاؤں کی تازہ بتازہ سبزی پکا کر کھاتے اور صبح فیکٹری کے بھونپو کے ساتھ ہی اٹھ کر فیکٹری کی طرف بھاگ اٹھتے۔

میرا نوکری میں ذرا جی نہیں لگتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا گویا قید کر دیا گیا ہوں۔ اس کے علاوہ چونکہ ٹھکائی کا اثر زائل ہو چکا تھا۔ اس لئے اختر کا عشق پھر عود کر آیا تھا۔ اور میں نے وقت بے وقت ٹھنڈی آہیں بھرنی شروع کر دی تھیں۔ فیکٹری میں جا کر اپنی میز پر بیٹھ کر یوں کام کرتا جیسے قیدی مشقت کر رہا ہو۔

میں نے تنگ آ کر توڑ پھوڑ کی پالیسی پر عمل کرنا شروع کر دیا۔

میری میز پر حل طلب فائیلوں کا انبار جمع ہو گیا تھا۔ میں نے ان کا حل تلاش کرتے ہوئے انھیں ایک بڑی لمبی چوڑی الماری کے پیچھے پھینکنا شروع کر دیا۔ ویسے میں ان فائیلوں کے مسائل پنشن لینے کے بعد بھی حل نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس پالیسی پر عمل کرنے کے بعد تیسرے ہی روز میری میز فائیلوں سے خالی تھی اور پانچویں روز میں جلو فیکٹری سے باہر تھا۔ اختر بیاہے جانے کے بعد دہلی چلی گئی تھی۔ میں بھی فیکٹری سے نکلنے کے بعد گھر سے بھاگ کر دہلی پہنچ گیا۔ چاندنی چوک کے ڈاک خانے میں کھڑے ہو کر اسے اس کی سہیلی بن کر خط لکھا اور اسے اگلے روز دوپہر کے فلمی شو پر جگت سینما بلایا۔ میں دو بجے سے لے کر پانچ بجے تک جگت سینما کے سامنے قلعے والی گراؤنڈ میں بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ لیکن اختر نہ آئی۔ دوسرے روز دوپہر کو میں اس کے گھر جا پہنچا۔ اس کا مکان حوض قاضی میں ایک جگہ تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر میں احمقوں کی طرح اندر کمرے میں داخل ہو گیا۔ اتفاق سے اس وقت وہاں سوائے اختر کے اور کوئی نہیں تھا۔ وہ تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ رنگ زرد ہو گیا اور ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"خدا کے لئے یہاں سے چلے جاؤ۔ وہ دوپہر کے کھانے کو آنے ہی والے ہیں۔"

میں نے نفرت سے تھوک کر کہا۔

"میں تمہارے حرامزادے "وہ" کو کیا سمجھتا ہوں"۔

"خدا کے لئے تمہیں مجھ سے محبت ہے تو واپس چلے جاؤ۔ میں نے بڑی مشکل سے تمہارے خط کا معاملہ رفع دفع کیا ہے۔ دیکھو میری زندگی تباہ کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں"۔

میں سچ مچ کا دیوداس بن گیا۔ میں نے اختر کے سر پر ہاتھ رکھ کر آبدیدہ ہو کر کہا۔

"ایسا نہ کہو پاروتی! میں جا رہا ہوں۔۔۔ کلکتے جا رہا ہوں۔"

اور میں سہگل کی طرح اپنے آنسوؤں کو چھپاتا سیڑھیاں اتر گیا۔ سیڑھیوں میں مجھے کے

سی ڈے کے گانے کی آواز آرہی تھی۔

جاؤ جاؤ رے میرے سادھو
رہو گورو کے سنگ

کلکتے میں ایک چھٹے ہوئے بدمعاش گرہ کٹ گورو صاحب کے سنگ چھ ماہ کی آوارہ گردی کے بعد امرتسر واپس پہنچا تو جنگ شروع ہو چکی تھی اور کلکتے کے شام بازار میں جاپانیوں نے ایک بے بی قسم کا چھوٹا سا بم بھی پھینک دیا تھا۔ اس دوران میں اختر کے ہاں ایک عدد لڑکی پیدا ہو گئی تھی اور میں کلکتے میں دو عدد مزید عشق کر چکا تھا۔ امرتسر والی ٹرانسپورٹ کمپنی سرگودھا کے نزدیک ہوائی اڈے کی تعمیر کا ٹھیکہ لیا تو والد صاحب قبلہ نے کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر سے میری بات کر دی۔ ڈائریکٹر والد صاحب کو تو خوب جانتے تھے۔ لیکن مجھ سے ناواقف تھے۔ چنانچہ فوراً مجھے ملازم رکھنے پر تیار ہو گئے۔

سردار خان اس نئی مہم کا مینجر بن کر ساتھ جا رہا تھا۔ میں سردار خان کا کلرک مقرر کر دیا گیا۔ دو روز تک کمپنی کے دفتر میں مجھے رجسٹروں میں پٹرول اور موبل آئل وغیرہ کے اندراج کی مشق کرائی گئی۔ تیسرے روز یہ قافلہ تیار ہو گیا تھا۔ تیرہ کی تیرہ لاریاں امرتسر ریلوے سٹیشن کے سیڑھیوں والے پل کی دوسری جانب گول باغ کے سامنے دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھیں اور ہر لاری کا ڈرائیور اپنے اپنے کلینر کو ساتھ لئے انجن کی آخری دیکھ بھال میں مصروف تھا۔

میرا بستر سردار خان کے بستر کے ساتھ لاری نمبر 3512 میں رکھ دیا گیا۔ یہ لاری بالکل نئے ماڈل کی تھی اور اس کا مالک جلال نامی پتلی ناک والا ان پڑھ دبلا سا آدمی تھا۔ جلال کسی زمانے میں پٹھان کوٹ کے علاقے میں گدھوں پر بجری لاد کر نہر کے ٹھیکیداروں کو سپلائی کیا کرتا تھا۔ اس نے یہاں تک ترقی کر لی کہ اپنی لاری لیکر کمپنی میں شریک ہو گیا۔ گھنگریالے کالے بال اس کے ماتھے پر رہتے۔ چہرے پر بچوں ایسی دھیمی سی مسکراہٹ ہر وقت کھیلا کرتی۔ بہت کم بولتا اور ہمیشہ کریون اے کے سگریٹ پیا کرتا۔ اس کے ساتھی لاریوں کے مالک اسے جالا کھوتیاں والا کہا کرتے تھے۔ اس خطاب پر اس نے کبھی ناپسند دیدگی --- یا ناراضگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ جس طرح اسے ڈرائیوروں کے "جلال صاحب" کہہ کہ پکارنے پر کوئی خوشی نہ ہوتی اسی طرح جب اس کے ساتھی اسے جالا کھوتیاں والا کہتے تو وہ کبھی اس کا برا

نہ مانتا۔ اس کے چہرے پر بچوں ایسی مسکراہٹ ویسی ہی رہتی اور کریون اے کے سگریٹ کو انگلیوں میں دبا کر وہ مٹھی بند کر لیتا اور اس کے کش لینے اور کھانسنے لگتا۔ اس کی کھانسی پر 1213 نمبر لاری کا کلینر سیلا کانا اپنی بڑھی ہوئی ڈاڑھی کھجا کر کہتا۔

"مائیں ہمیں "لیمپ" سے کچھ نہیں ہوتا اور اسے کرے ون سے کھانسی آتی ہے۔"

سیلا کانا بٹالے کا رہنے والا تھا۔ وہاں اس نے آنکھ کھولنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ چھابڑی لگا کر شکر قندی اور سنگھاڑے بیچے تھے۔ ریلوے سٹیشن پر مزدور کا کام کیا تھا ایک لوہار کی بھٹی کو پاؤں سے پنکھا کرنے کا کام کیا تھا۔ یہیں اس کی دونوں آنکھوں میں ککرے پڑے تھے جو ابھی تک موجود تھے۔ اسی شہر میں اس کی شادی ایک ماچھی کی لڑکی سے ہوئی تھی اور اسی شہر میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ لڑکی سیلے کانے کو چھوڑ کر ایک دھوبی کے ساتھ نکاح کر بیٹھی تھی۔ سیلا کانا بسوں کے اڈے پر بٹالے سے امرتسر جانے والی لاری کے سامنے کھوکھے پر بیٹھ کر سردیوں گرمیوں "چل سواری کوئی امبر سر" کی آوازیں لگانے لگا۔ پھر وہ کلینر ہو گیا اور ابھی تک کلینر ہے اور امید ہے کہ موت تک کلینر ہی رہے گا۔ اس کے بال تربوز ایسے سر پر سرکنڈوں کی طرح کھڑے رہتے ہیں ان میں بے شمار سفید بال بھی ہیں۔ آنکھوں کے پپوٹوں کا کچھ حصہ سرخ ہو کر باہر کو الٹا رہتا ہے۔ آنکھوں سے ہر وقت پانی بہتا ہے۔ پاؤں سے ننگا، جسم پر چیتھڑے لٹکائے ایک میلی چادر سے نصف بدن ڈھانپے وہ پرانا کپڑا لے کر کھڑی گاڑی کے نیچے گھس جاتا ہے اور سڑک پر چت لیٹ کر انجن کی بریکوں اور ٹائی راڈ وغیرہ کی صفائی کرنے لگتا ہے۔ اس کا استاد یعنی 1213 نمبر لاری کا ڈرائیور بھاری بھرکم گول سر والا ادھیڑ عمر کا کشمیری آدمی ہے جسے خواجہ کہتے ہیں اس کی ایک آنکھ میں پھولا ہے اور چھوٹے چھوٹے دانت زیادہ ہنسے بغیر دکھائی نہیں دیتے۔ گالی ہر وقت زبان پر رہتی ہے اور بات بات پر لڑنے کو تیار رہتا ہے۔ کھڑے کھڑے چھ سات قلچوں کے ساتھ سیر بھر دہی کھا جانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اپنے کلینر سیلے کانے کے سر پر ہمیشہ دھپ مار کر اور اسے گالی دے کر بات کرتا ہے۔

میں ٹرانسپورٹ کمپنی کے دفتر میں سردار خان اور مینجنگ ڈاریکٹر کے پاس بیٹھا ضروری رجسٹر اور کاغذات تھیلے میں سنبھال رہا تھا کھڑکی کے شیشوں میں سے مجھے ڈرائیور اپنی اپنی لاریوں کا طواف کرتے اور کلینر مڈگارڈوں، بونٹوں اور سکرین کے شیشوں پر کپڑا پھیر کر

چمکاتے صاف نظر آرہے تھے۔ میرا اور سردار خاں کا بستر اور سوٹ کیس جالے کھوتیاں والے کی نئی ماڈل کی لاری میں رکھوا دیا گیا تھا۔ دس بجے کے قریب ہم نے ڈاریکٹر سے مصافحہ کیا اور گاڑی میں آکر بیٹھ گئے۔ تمام ڈرائیوروں نے اپنی اپنی نشستیں سنبھال لیں وہ گاڑیوں میں بیٹھے بیٹھے بھی کھلی کھڑکیوں میں سے ایک دوسرے کو اپنی اپنی بیویاں امرتسر میں اکیلی چھوڑ جانے پر فحش مذاق کر رہے تھے اور سر باہر نکال نکال کر تھوک رہے تھے۔ ہر گاڑی کا کلینر راستے کا اشارہ دینے کے لئے اپنی اپنی لاری کے سامنے سڑک پر آکر کھڑا ہو گیا تھا۔ سردار خان کے اشارے پر سب سے پہلے ہماری گاڑی یعنی 3512 سٹارٹ ہوئی اور اس کے بعد ساری لاریاں ہمارے پیچھے چل پڑیں اور یوں یہ تیرہ لاریوں کا قافلہ سرگودھا کی طرف روانہ ہو گیا۔

سردار خان لمبے قد، چوڑے بدکاٹھ اور نسواری رنگ کا پینتیس چالیس سال کا آدمی تھا جس کی نسواری آنکھیں بڑی چوکس رہا کرتیں اور ذرا سی بات پر چمکنے لگتیں۔ ویسے تو وہ آٹھویں جماعت پاس تھا مگر اسے ڈرائیونگ لائن کا بڑا تجربہ تھا اور تھوڑی بہت انگریزی لکھ پڑھ لیتا تھا۔ بڑا خرچیلا اور دل کا کھلا آدمی تھا۔ وہ ہوشیار پور کا رہنے والا تھا اور گرمیوں سردیوں بڑا اچھا لباس پہنتا تھا۔ اس کے ہونٹ سیاہی مائل تھے مگر دانت بڑے ہموار اور سفید تھے۔ قد لمبا اور جسم پتلا ہونے کی وجہ سے وہ چلنے میں بالکل لگڑ بگڑ معلوم ہوتا۔ آدمی کند ذہن تھا لیکن آنکھوں میں ذہانت اور ہوشیاری کی چمک تھی۔ یہ ذہانت اس کے تجربے اور حوصلہ مندی کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ وہ کیونڈر کے سگریٹ پیتا تھا۔

چوہڑکانے پہنچ کر لاریاں رک گئیں اور ڈرائیور سروں پر سے گرد جھاڑتے اور سگریٹ سلگاتے لاریوں میں سے باہر نکلے اور معمولی سے ہوٹلوں کی طرف کھانا کھانے چل پڑے۔ سردار خان ایک ہوٹل کے باہر بینچ پر بیٹھ گیا اور کوٹ کی آستین جھاڑ کر بولا۔

"دوستو ذرا جلدی جلدی کام دکھانا۔ ابھی سارا راستہ پڑا ہے۔"

خواجہ کشمیری اپنا دھسہ کندھے پر ڈالتے ہوئے بولا۔

"خاں جی! سیانے کہہ گئے ہیں کہ کھانا اور عورت سے محبت کرنا۔ یہ دونوں کام آہستہ آہستہ کرنے چاہئیں"۔

سردار خان نے مسکرا کر کہا۔

"وہ سیانا کون تھا ذرا ہمیں بھی تو بتاؤ۔"

جالے کھوتیاں والے نے کریون اے کی راکھ جھاڑ کر کہا۔

"میرا خیال ہے وہ خواجہ کا سسر ہی ہو سکتا ہے۔"

1213 کے ڈرائیور خواجہ نے دانت نکال کر کہا۔

"جلال صاحب آپ بادشاہ ہیں جو چاہے کہہ لیں"۔

سردار خان نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

"اوئے چھبی اٹھتی (2638 پی بی ایل) کہاں چلی گئی؟ کہیں راستے میں ہی تو نہیں رہ گئی؟"

2638 ایل۔ بی۔ پی اس قافلے کی سب سے پرانی اور چھکڑا میل لاری تھی۔ اس لاری کے سوائے بھونپوں کے ہر شے بولتی اور آواز دیتی تھی۔ چلتی تو اس کی کھڑکھڑاہٹ کا شور سن کر جانور درختوں پر سے اڑ جاتے اور راہگیر دو فرلانگ دور سے ہی رستہ چھوڑ دیتے۔ اس کا ڈرائیور ایک سکڑا ہوا ادھیڑ عمر کا چھوٹے قد کا آدمی تھا، جو سفید پگڑی کوٹ اور شلوار پہنتا۔ اسے ٹی بی تھی اور مونچھیں بھی تھیں اور تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کھانستا رہتا تھا۔ اس نام امام دین تھا اور ڈرائیور اسے ماما مونچھوں والا کہتے تھے۔ امام دین پاسنگ شو کے سگریٹ پیتا تھا۔ بڑا ہوشیار اور لونڈوں کو پسند کرنے والا آدمی تھا۔ زبان بڑی میٹھی تھی مگر کلینر کو گالی دینا کبھی نہیں بھولتا تھا، پیچھے ایک عدد بیوی اور چھ بچے چھوڑ کر جا رہا تھا۔ سردار خان کی آواز پر امام دین ڈرائیور نے 1213 نمبر کی گاڑی کے عقب سے اپنا پگڑی اور مونچھوں والا سکڑا ہوا چہرہ نکالا اور بولا۔

"خاں جی آپ کا غلام حاضر ہے۔"

سردار خان نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ماما جی راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟"

2223 ایل۔ بی۔ پی کا پہلوان نما باکسر قسم کا بڑ بولا اور احمق ڈرائیور گامی بولا۔۔۔

"بس جی یہی تکلیف ہوئی ہے کہ کوئی لونڈا دکھائی نہیں دیا"۔

"گامی دیا پترا بینڈل مار کر سر پھوڑ دوں گا"۔

امام دین کے ناراض ہونے پر گامی باکسر بغلیں بجا کر ناچنے لگا۔

ہٹ کے بدھو، ہٹ کے بدھو، ہٹ کے بدھو۔

ڈرائیوروں اور کلینروں نے خوب پیٹ بھر کر بکروں کی طرح کھایا اور ڈکاریں بھرتے، سگریٹ سلگاتے بینچوں پر سے اٹھ کر اپنی اپنی لاریوں کے مڈگارڈوں سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے اور دھوپ سینکنے لگے۔ میں سردار خاں اور جلال کھانا کھانے کے بعد چائے پی رہے تھے۔ سردار خاں اپنی نسواری آنکھیں مٹکا مٹکا کر جلال کو سرگودھے کی کنجریوں کے بارے میں بتا رہا تھا۔

"جالے خاں بس یہ سمجھ لو کہ ان کی رانوں پر چٹکی بھرنے سے گھی ٹپکتا ہے گھی۔"

"ہائے جی۔"

جالے کھوتیاں والے نے جوش محبت میں آ کر سردار خاں کے گال پر چٹکی بھر لی، باہر ڈرائیوروں نے ہارن دے کر شور مچا دیا۔

"چلو جی خاں جی چلو۔"

سردار خاں نے وہیں سے گالی دے کر آواز لگائی۔

"ٹھہر اوئے تہاڈی ماں دا ہارن ماریا۔"

ڈرائیوروں کو دراصل یہ لالچ تھا کہ اگر شام سے پہلے پہلے وہ سرگودھے پہنچ جائیں تو راستے میں انہیں کئی ایک سواریاں مل جائیں گی۔ چنانچہ انہوں نے یہی کیا۔ ہماری گاڑی تو سب سے آگے جا رہی تھی، پیچھے ان ڈرائیوروں نے جگہ جگہ گاڑی کھڑی کر کے سواریاں لینا شروع کر دیں، اگرچہ سردار خاں نے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا تھا مگر یہ جنس ایسی نہیں ہوتی کہ ان پر اتنی آسانی سے کسی بات کا اثر ہو جائے ڈرائیور تو اگر گدھے پر بیٹھا بھی جا رہا ہو گا تو راستے میں سواری لینے سے باز نہیں آئے گا، لاریوں میں سیٹیں کبھی بھی نہیں تھیں۔ لیکن ضرورت مند دیہاتی مسافر فرش پر ہی بیٹھ جاتے۔ اس طرح ہر لاری کے ڈرائیور نے سرگودھا پہنچنے تک چھ چھ سات سات روپے بنا لئے اور جنگ کے دنوں میں یہ رقم کافی ہوا کرتی تھی، بلکہ ایک بار تو جلال نے بھی جو گاڑی کا مالک تھا اور کریون اے کے سگریٹ پیتا تھا سڑک کے پاس کچھ مسافروں کو کھڑا دیکھ کر کہا۔

"سواریاں لے ہی لیں یار"۔

سردار خان نے اس کے کندھے پر تھپڑ مار کر کہا۔

"فٹے منہ کافرا۔۔۔ آخر جالاکھوتیاں والا ہی نکلے تم۔"

چنیوٹ پہنچ کر یہ قافلہ چائے پینے کے لئے رک گیا۔

سردار خاں پتلون کو گھٹنوں پر سے جھاڑتا گاڑی سے نیچے اترا اور مجھے ہاتھ دکھا کر بولا۔

"بخار معلوم ہوتا ہے بٹ جی۔"

میں نے کلائی تھام کر کہا۔

"یہی معلوم ہوتا ہے۔"

"فکر نہ کرو سرگودھے کے ماٹلے اٹن شن کر دیں گے۔"

لاری نمبر 3434 کالم ترنگ دبلا پتلا آگے کو جھکا ہوا چالیس سالہ ڈرائیور تھوڑا بہت لکھا پڑھا ہونے کا دعوے کرتا تھا اور اسے کہانیاں پڑھنے اور تاریخ کے مطالعے کا بڑا شوق تھا۔ یہ پہلا ڈرائیور تھا جو دوسرے ڈرائیوروں سے مختلف تھا لیکن سٹیرنگ پر بیٹھ کر وہ بھی دوسرے ڈرائیوروں کی طرح ہو جاتا اور کلینر کو دھپ لگانی اور گالی دینا کبھی نہ بھولتا۔ ویسے کم سخن تھا اور موقع محل پر بڑی کار آمد بات کرنے کا عادی تھا۔ اپنے ساتھ ٹرک میں اردو کے ایسے رسالوں کا انبار لایا تھا جن میں انگریزی کہانیوں کے تراجم چھپے ہوئے تھے۔ اس تاریخ و ادب کے کم سخن رسیا کا نام تو کرم نواز تھا مگر سب ڈرائیور اسے راجگورو کہہ کر پکارتے تھے۔ کیونکہ اس سے پٹرول بچا کر چوری چھپے بیچنے اور عورتوں کو پھانسنے تک ہر قسم کے معقول مشورے لئے جا سکتے تھے۔ اس کی ناک لمبی، خشخشی کھوپڑی چوڑی، شانے فراخ اور صفاچٹ چہرے پر منہ کا دہانہ تھوڑا پیچھے کو ہٹا ہوا تھا۔ چمکیلی کرنجی آنکھیں ہر وقت سکڑی رہتیں اور چہرے پر ایک قسم کی بے نیازانہ اور لاابالی سی مسکراہٹ سدا کھیلتی رہا کرتی۔ ڈاڑھی وہ دوسرے ڈرائیوروں کی طرح تیسرے روز منڈواتا اور نہاتا ہر روز تھا۔

راجگورو نے چائے کے تین کپ پی چکنے بعد کے 1213 ایل۔ بی۔ پی کے بھاری بھر کم بینڈک نما منہ پھٹ ڈرائیور خواجہ کے سگریٹ سے سگریٹ سلگا کر کہا۔

"اس پہاڑی کو دیکھ رہے ہو خواجہ؟"

خواجہ نے آنکھوں پر ہاتھ کا چھجہ بنا کر ایڑیاں اٹھا کر پوچھا۔

"کونسی پہاڑی؟ وہ جہاں ایک عورت کھڑی ہے؟"

"ہاں وہی"۔

"کیا ہوا اس پہاڑی کو راجگورو؟

"اس پہاڑی پر کبھی سکندر اعظم کی فوجوں نے پڑاؤ ڈالا تھا"۔

خواجہ نے جو بہت جلد حیران ہو جایا کرتا حیران ہو کر کہا۔

"سر سکندر حیات کی فوجوں نے؟"

2638 کے مدقوق ڈرائیور امام دین عرف ماموں جان نے سگریٹ کا کش لگا کر مونچھوں کو مروڑتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے تمہیں تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں؟"

خواجہ ماموں جان کی گال پر چٹکی بھر کر بولا۔

"ماما جی میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ آج پندرہ تاریخ ہے"۔

3434 ایل۔ بی۔ پی کا فلسفی ڈرائیور راجگورو دیر تک سگریٹ پی کر سکڑی ہوئی آنکھوں اور مسکراتے ہوئے چہرے سے چنیوٹ کی جلی سڑی پہاڑی کو تکتا رہا اور خواجہ اپنی آنکھوں کے کگروں کو میلی دھوتی کے پلو سے پونچھتا دوسری طرف چل دیا۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد سردار خاں نے اپنی گاڑی کا ہارن بجا دیا۔

"چلو بھئی چلو۔ بہت دیر ہو گئی۔ گامی تم کیا باکسنگ کرنے لگے؟"

2223 ایل۔ بی۔ پی کے پہلوان نما ڈرائیور گامی سڑک کے بیچ میں اپنے کسرتی بدن والے کینسر پھیکے سے زور آزمائی کر رہا تھا۔ سردار خاں کی آواز سن کر اس نے پھیکے کو چھوڑ دیا اور دونوں ہاتھ زور سے سر پر مل کر بولا۔

"ذرا بدن ٹوٹ رہا تھا خاں جی۔"

لاریوں کا قافلہ آگے چل پڑا۔

یہاں سے سرگودھا زیادہ دور نہیں تھا۔ دن ڈھل چکا تھا۔ اور دھوپ کا رنگ سنہری ہو جاتا تھا۔ دریائے چناب کے دونوں ریلوے پل عبور کرنے کے بعد ہمارے ارد گرد سوکھے اور بنجر پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کھیتوں میں سرسوں پھولی ہوئی تھی اور سردی بڑھ گئی تھی۔ نومبر کے آخری دن تھے۔ ان دنوں فضا ایٹمی دھماکوں سے مسموم اور ناقابل اعتبار نہیں ہوئی تھی اور نومبر میں کافی سردی ہو جایا کرتی تھی۔ میں چنیوٹ سے 3512 نمبر گاڑی سے اٹھ کر راجگورو کی 3434 نمبر گاڑی میں اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ایک

جگہ بڑا پر فضا مقام آیا۔ بائیں جانب پہاڑیوں میں گھری ہوئی ایک بڑی سر سبز وادی آئی۔ وادی کیا تھی بس ہرے بھرے کھیت تھے جن میں کہیں کہیں سرسوں کے بسنتی ٹکڑے ڈھلتے سورج کی سنہری دھوپ میں خواب ایسا منظر پیش کر رہے تھے۔ راجگرو نے اس منظر کو دیکھ کر آنکھیں پہلے سے زیادہ سیکٹر لیں اور کچھ نہ بولا، میں نے گاڑی چلاتے ہوئے سوائے خواجہ ہینڈک کے اور کسی ڈرائیور کی زبان کو چلتے نہیں دیکھا۔ میں نے تازہ اور سبزے کی مہک سے لدی ہوئی ٹھنڈی ہوا کا بھرپور سانس لے کر کہا۔

"کتنا پیارا منظر ہے"۔

راجگورو کی آنکھیں سامنے سڑک پر جمی ہوئی تھیں۔ آنکھیں سکڑی ہوئی تھیں اور چہرے پر وہی لاابالی سی مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ میری بات سن کر وہ بالکل خاموش رہا۔ پھر جب ہم کافی آگے نکل آئے اور میں اس منظر کو بھول گیا تو راجگورو اچانک بولا۔

قدرت نے بھی کیا کیا سبزیاں بنائی ہیں۔ میں ایک رسالہ ساتھ لایا ہوں اس میں ایک انجن ڈرائیور کی کہانی ہے۔ یہ انجن ڈرائیور انگریز تھا اور جب وہ گاڑی لے کر پہاڑوں میں سے گزرتا تو لکھتا ہے کہ چاروں طرف سوائے قدرت کی سبزیوں کے اور کچھ نہ ہوتا۔

سرگودھے پہنچ کر میں وہ رسالہ تمہیں پڑھنے کو دوں گا"۔

خواجہ ہینڈک ڈرائیور نے لالیاں سے ایک زنانی سواری بٹھالی تھی۔ یہ عورت صحت مند اور جوان تھی۔ اور گود میں ایک بچہ اٹھائے ہوئے تھی، خواجہ ہینڈک سرگودھے تک اس عورت سے پیار محبت کی باتیں کرتا آیا۔ اس کی بچی کو ایک دونی بھی دی۔ اور اس عورت کا اتا پتہ بھی معلوم کر لیا۔ اس عورت کا نام بقول خواجہ ہینڈک مہراں تھا اور وہ کسی سقے کی بیوی تھی جو سرکاری دفاتر میں پانی بھرنے اور چھڑکاؤ کرنے پر ملازم تھا۔ جب سردار خاں نے اس کی سرزنش کی اور کہا کہ وہ کمپنی کو بدنام کر رہا ہے تو خواجہ ہینڈک توند پر ہاتھ پھیر کر گردن ایک طرف جھکا کر بڑی لجاجت سے بولا۔

"خاں جی گستاخی معاف۔ گھر والی امرتسر میں رہ گئی ہے۔ اب ہم اکیلے سرگودھے میں کیا بھنگ گھوٹتے پھریں؟"

خاں نے تنبیہ کی۔

"اگر کوئی گڑبڑ کی خواجہ تو مجھے اچھی طرح جانتے ہو تم۔"

محمد طارق اقبال
پاکستانی ڈائجسٹ ڈاٹ کام

2

جنگ کے زمانے میں سرگودھا اتنا گنجان آباد، مہنگا اور گندہ شہر نہیں تھا، جتنا اب ہو گیا ہے۔ ان دنوں یہاں کا کمپنی باغ بڑا سرسبز تھا اور خوب پھول کھلے رہتے تھے۔ دودھ بڑا خالص ملا کرتا تھا اور ایک ابال کے بعد اس پر آدھ انچ موٹی بالائی کی تہہ جم جاتی تھی۔ صرف کنک منڈی اور صابن کے کارخانوں کے قرب وجوار میں ٹریفک کا ہنگامہ شور اور کیچڑ ہوتا تھا۔ وگرنہ تمام شہر کی سڑکی سڑکیں کشادہ صاف ستھری اور لوگوں کے بے معنی ہجوم سے خالی ہوا کرتی تھیں۔ ان دنوں اس شہر کا اپنا ایک نمایاں کلچر تھا اور یہاں کی پھلکاریاں، تلے کے کھسے، لنگیاں، کھیس صابن، مالٹے، سوکھا تمباکو، حقے، لمبے طروں والے زمیندار اور بھوک زدہ کسان بڑے مشہور تھے۔ پاکستان بن جانے کے بعد تو یہاں بھی دوسرے شہروں کی طرح آبادی بڑی بڑھ گئی ہے۔ مکان اور کوٹھیاں کھیتوں میں دور تک گھستی چلی گئی ہیں۔ شور اور ہنگامے میں اضافہ ہو گیا ہے۔ لنگیوں اور پھلکاریوں کے ساتھ میرٹھ کی قینچیاں، علی گڑھ کے تالے بھی نظر آنے لگے ہیں۔ کئی کلچر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے، دودھ پر سے بالائی اڑ گئی ہے۔ مالٹوں کا رنگ مصنوعی حد تک سرخ ہو گیا ہے صابن جھاگ زیادہ دینے اور میل کم اتارنے لگے ہیں۔ اگر کچھ باقی بچا ہے تو صرف لمبی لمبی موٹروں والے طرہ باز زمیندار اور مفلس کسان۔!

میں تو ان دنوں کی بات کر رہا ہوں جب اس شہر میں ہندو مسلم اور سکھ مل جل کر رہتے تھے اور جنگ عظیم کی ہلاکت آفرینیوں کے باوجود یہاں بڑا امن اور شانتی تھی، باغوں میں پھول کھلا کرتے تھے دودھ پر بالائی آیا کرتی تھی۔ مالٹے سرخ کم مگر میٹھے زیادہ ہوتے تھے، لوگ اخلاق اور مخلصی کی باتیں کم کرتے تھے اور محبت زیادہ کرتے تھے اور آڑھتی کریانہ مرچنٹ یا کپڑے کا بیوپاری اپنی دن بھر کی کمائی صدری میں ڈال کر نصف شب کو بلا کھٹکے گھر چلا جایا کرتا تھا، چونکہ تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ زمانے کو کبھی ثبات نہیں اس لئے ہمیں انسان کے مستقبل سے ناامید نہیں ہونا چاہیے، اگر انسانوں نے ایک بار محبت کر کے نفرت کو اپنا لیا ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ ایک بار پھر وہ آپس میں محبت کرنے لگیں۔

ڈرائیوروں کا یہ قافلہ کچہری بازار کے ایک ہوٹل میں آ کر بیٹھ گیا۔ ہوٹل کے مالک نے بڑی خوشی سے ہمارا خیر مقدم کیا اور نوکروں کو فوراً ہدایت کی کہ اندر سے فالتوں کرسیاں لا کر بچھا دی جائیں، ہوٹل کا بس ایک ہی کشادہ کمرہ تھا جس کی دیواروں کے ساتھ ساتھ میزیں لگی تھیں اور لوگ دیواروں کی طرف منہ کر کے کھانا وغیرہ کھا رہے تھے۔ نوکر نے جلدی سے دو تین حقے لا کر رکھ دیئے۔

"واہ بھئی واہ! اصل تمباکو تو یہ ہوتا ہے۔ ہم تو بہن یادی سگرٹوں سے تنگ آ گئے ہیں۔"

سردار خاں نے حقے کی نے منہ میں لے کر خوشی سے کہا۔

ڈرائیور کرسیوں پر بیٹھ گئے سردار خاں نے ہوٹل کے مالک کو کہا۔

"ملک جی! بس ان سانڈوں کے جو پکا ہے ڈال دیں۔!"

ہوٹل کا گورا چٹا صحت مند مالک ہنسنے لگا۔ ڈرائیوروں نے بھی ہنس کر سردار خاں کے اس انقلاب کو قبول کر لیا۔ اس کے بعد تنور کی بادامی رنگ کی خوشبودار گرما گرم روٹیاں چنگیروں میں لا کر گرم پالک کے ساگ کے ساتھ آ گئیں اور ہم سب واقعی سانڈوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ کھانے کے بعد چائے کا دور چلا اور پھر حقے کی نے کی گردش کے ساتھ ادھر ادھر کی باتوں کا دور شروع ہو گیا۔ ہوٹل کا کھانا بے حد لذیذ تھا۔ ہم سبھوں کو خوب بھوک لگ رہی تھی۔ ہم نے سیر ہو کر کھایا۔

رات کو سونے کا کچھ انتظام پہلے ہی سے ہو چکا تھا۔ کمپنی کے ایک حصہ دار حاجی صاحب پہلے ہی سے سرگودھا پہنچ گئے تھے۔ وہ ہمیں ہوٹل میں مل گئے۔ پستا ناک نقشہ، ناٹا قد، مضبوط بدن، پنتالیس سال کی عمر، گورا اور سرخ رنگ، پورے کشمیری، چھوٹی چھوٹی مونچھیں اور فرنچ کٹ ڈاڑھی، کوٹ شلوار میں ملبوس، سر پر قراقلی کی گول ٹوپی۔۔۔۔۔۔ بڑے باتونی، کرخت آواز مگر بڑے خوش مزاج بات کی کھال نکالنے والے، کسی بھی مسئلے پر گھنٹوں بے تکان بولنے والے پانچوں وقت کے نمازی، بڑے پرہیز گار نہ جانے سوسائٹی کو "سواسائٹی" کیوں کہتے تھے۔۔۔۔ ان کی کئی ایک دوسری باتوں کی طرح یہ بات بھی کبھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ انہوں نے سردار خاں سے ملتے ہی کہا۔

"راستے میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی خاں جی؟ ہماری سواسائٹی نے آپ لوگوں کی

سہولت کا پورا بندوبست کر رکھا ہے۔"

اور وہ پورا بندوبست یہ تھا کہ سردار خاں اور 3512 نمبر لاری کا مالک اپنا ریشمی اور کریون اے کا ڈبہ لے کر بڑی مسجد کے ساتھ والے ایک خوبصورت ہوٹل کے کمرے میں پہنچ گیا۔ آدھے ڈرائیور اسی ہوٹل کی شکستہ اور بوسیدہ کوٹھڑیوں میں دھکیل دیئے گئے جہاں ہم نے کھانا کھایا تھا اور باقی آدھے ڈرائیوروں کو لاریوں کے اڈے والی کوٹھڑی میں چارپائیاں بچھا دی گئیں۔ ان ڈرائیوروں میں یہ خاکسار یعنی راقم الحروف بھی شامل تھا۔

یہ کوٹھڑی ریلوے پھاٹک کے پاس واقع تھی۔ اس کے دروازے میں کھڑے ہو کر اگر مشرق کی طرف منہ کریں تو ریلوے سٹیشن بالکل سامنے دکھائی دیتا تھا۔ ریلوے لائن قریب ہی سے گزرتی تھی۔ رات کو سٹیشن کے سگنلوں کی سرخ اور سبز بتیاں ٹھٹھرتی سردی اور شبنم سے نکھری ہوئی فضا میں بڑی صاف دکھائی دیا کرتیں۔ باہر شیشم کا ایک بڑا سا پیڑ تھا۔ پاس ہی ہینڈ پمپ لگا تھا اور پھاٹک کا لوہے کا جنگلہ سڑک کے کنارے کنارے چلا گیا تھا، دوپہر کو ہم لوگ لنگوٹ باندھ کر بدن پر کڑوے تیل کی مالش کر کے نہاتے اور کپڑے اس جنگلے کی آہنی تاروں پر پھیلا دیتے۔ دن بھر میدان میں لاریوں کی آمدورفت کا تانتا بندھا رہتا اور چرواہے بکریوں کو لائن کے آر پار چرایا کرتے۔ اگر کوئی بکری ہماری کوٹھڑی کے آس پاس آجاتی تو گامی باکسر ڈرائیور اسے اٹھا کر کوٹھڑی میں لے آتا اور کٹورے میں اس کا سارا دودھ دھو لیتا۔ کوٹھڑی اگرچہ کشادہ تھی اور وہاں چھ سات چارپائیاں بڑی آسانی سے بچھ گئی تھیں لیکن اس کا فرش کچا تھا۔ اور دیواروں کا پلستر اکھڑ چکا تھا اور پرانی اینٹوں کا چونا نیچے گرا کرتا چھت کی کڑیاں دھوئیں کی کالک میں گم ہو چکی تھیں۔ اور کونوں میں مکڑیوں نے جالے لٹکا رکھے تھے۔

3434 ایل۔ بی۔ پی کے فلسفی ڈرائیور راجگورو نے اندر داخل ہوتے ہی لمبی ناک سکیڑ کر کہا۔

"یہاں ضرور کبھی جعلی نوٹ بنانے والوں کا ٹھکانہ رہا ہے۔"

خواجہ مینڈک نے سر جھاڑ کر کہا۔

"خواجہ پھر یہاں ضرور کہیں نہ کہیں نوٹ دبے ہوں گے۔"

گامی باکسر بولا۔

"راجگورو تم ذمے دار ہو تو میں ابھی سارے فرش کو اکھیڑ کر اس کا اکھاڑا بنا دوں۔"

راجگورو نے مسکرا کر کہا۔

"سردار خاں سے پوچھ لو۔"

گامی بولا۔

"اس کی ایک آنہ پتی رکھ لیں گے۔"

خواجہ بینڈک نے ایک دم چونک کر پوچھا۔

"اوے گامی تاش لے آئے ہو ناں؟"

گامی نے ران پر ہاتھ مار کر کہا۔

"خواجہ بینڈک فکر نہ کر پترا۔ ننگی میم والی تاش لایا ہوں"

2638 کا مدقوق ڈرائیور کھڑکی کے پاس اپنی چارپائی پر بستر بچھاتے ہوئے بولا۔

"پترو حاجی صاحب سے تاش بچا کر رکھنا"۔

خواجہ زور سے ناک صاف کر کے کہنے لگا۔

"پھر کیا ہوا۔ حاجی صاحب کو میم پسند آگئی تو انہی کے ساتھ دو کلمے پڑھوا دیں دگے"۔

2638 ایل۔ بی۔ پی کے مدقوق ڈرائیور امام دین نے کھڑکی کے پاس اپنی چارپائی اس لئے بچھوائی تھی کہ جب اس پر کھانسی کا حملہ ہو تو اسے باہر تھوکنے میں آسانی ہو۔ خواجہ نے شہادت کی انگلی ہوا میں اٹھا کر امام دین کو صاف صاف کہہ دیا۔

"ماموں جان جی اگر تم نے رات کو کھانس کھانس کر ہماری نیند حرام کی تو تمہاری چارپائی ڈولی ڈنڈا کر کے سردار خاں کے ہوٹل میں پہنچا دی جائے گی۔" امام دین نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"خواجہ یہ بھلا میرے اختیار میں ہے"۔

"کیوں نہیں؟ تم انجن کا پسٹن ٹھیک کر سکتے ہو اور اپنی کھانسی ٹھیک نہیں کر سکتے؟"

امام دین، ہنس پڑا اور ساتھ ہی اس پر کھانسی کا حملہ ہو گیا۔

خواجہ بینڈک نے اسے موٹی گالی دے کر اپنا سر لحاف میں چھپا لیا۔ ایک مٹیالا سا بلب چھت کے درمیان ۔۔۔۔ لٹک رہا تھا گامی باکسر اپنے بچھونے پر بیٹھا مونچھوں اور چہرے پر

کڑوے تیل کی مالش زور زور سے کر رہا تھا۔ نہ اسے خبر تھی کہ امام دین ٹی بی کا مریض بری طرح کھانس رہا ہے اور نہ ہی راجگورو کو اس کا کچھ احساس تھا۔ جو اپنے بستر پر بیٹھا بڑے اہتمام سے لحاف کے اندر پھٹا ہوا کمبل جوڑ رہا تھا۔ ان سبھوں کے بستر گندے، لحاف پھٹے ہوئے اور کھیس میل سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ خود بھی میلے کچیلے سویٹروں، کرتوں اور دھوتیوں میں ملبوس بستروں میں دبکے ہوئے تھے۔ یہ ڈرائیور اچھا خاصا کما لیتے تھے۔ تنخواہ کے علاوہ انہیں کمیشن بھی ملتی تھی اور ویسے بھی یہ لوگ پٹرول وغیرہ بچا کر بیچ دیا کرتے تھے۔ پھر بھی ان کے لباس اور بستروں کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ کسی یتیم خانے سے اٹھا لائے ہیں۔ دراصل یہ لوگ یا تو روپیہ جمع کرتے تھے اور یا شام تک کھانے پینے، رنڈی بازی اور شراب نوشی میں سارا پیسہ اڑا دیتے تھے۔ میں نے ان لوگوں میں درمیانہ یعنی سفید پوش طبقہ نہیں دیکھا تھا۔ یہ لوگ یا تو کیونڈر کے سگریٹ پیتے اور یا پھر حقہ اور لیمپ کا سگریٹ پیتے۔ یا تو شراب پی کر رنڈیوں کے بازار میں بھڑکیں مارتے پھرتے اور مجرا سن کر نوٹ کاغذ کے پرزوں کی طرح پھینکا کرتے اور یا تنور پر دال روٹی کھا کر سارا پیسہ اپنی بیوی کو بھیج دیا کرتے ۔ یا تو بیویوں کو برا بھلا کہا کرتے۔ انہیں اپنی جوانی کی بربادی کا ذمہ دار ٹھہراتے اور یا شراب پی کر اپنے بچوں کو یاد کر کے رویا کرتے۔ ان میں شیر گل نامی فیروز پور کا رہنے والا ڈرائیور پانچ وقت کا نمازی تھا مگر خوبصورت لونڈیوں سے بغل گرم کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اور وہ اپنے اس فعل پر اتنے اعتماد اور خوش اعتقادی سے کاربند تھا کہ کبھی اس پر نادم نہیں ہوا تھا۔ جیسے یہ بھی اس کی عبادت کا ایک حصہ ہو۔

کوئی لونڈا اس سے دو منٹ باتیں کرنے کے بعد اس کا دوست بنے بغیر نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے برعکس گامی باکسر نے کبھی کوئی نماز نہیں پڑھی تھی۔ مگر وہ خدا سے بہت ڈرتا تھا اور شراب پی کر جب نشے میں دھت ہو جاتا تو رو رو کر خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگا کرتا۔

رات کو سردار خاں نے کلینر بھیج کر مجھے اپنے ہوٹل بلوا بھیجا۔

میں رجسٹر لے کر وہاں پہنچا تو دیکھا کہ سردار خاں سر پر گرم اونی ٹوپی اوڑھے زرد رنگ کی چھینٹ کے نئے لحاف میں دبکا بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے۔

"میں نے کہا ذرا بٹ صاحب کو رجسٹروں کا حساب کتاب سمجھا دوں"۔

اور وہ حساب کتاب یہ تھا کہ جب صبح شہر کے مختلف علاقوں سے روڑی اور بجری لاد کر زیر تعمیر ہوائی اڈے پر جائیں گی تو ان کے پھیروں اور پٹرول کی کھپت کا اندراج کیونکر کرنا ہوگا۔ کوئی دس منٹ میں میں ان نکتوں کو سمجھ گیا۔ سردار خاں نے میرے لئے چائے منگوائی۔ جلال کھوتیاں والا اس کے ساتھ ہی اپنے اجلے بستر میں لیٹا کریون اے کا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے چائے کی پیالی تھام کر کہا۔

"سردار خاں ذرا بٹ صاحب کو وہ نکتہ بھی سمجھا دو کہ ڈرائیور پٹرول کا غبن کیسے کرتے ہیں"۔

اگرچہ یہ نکتا ذرا ٹیڑھا تھا۔ لیکن میں نہ بہت جلد اسے بھی ذہن نشین کر لیا۔

"اس سے بڑی اور کیا تکلیف ہو گی کہ ڈرائیوروں کے ساتھ رہنا پڑ رہا ہے"۔

میں کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد واپس کوٹھڑی میں آیا تو سوائے 2638 ایل۔ بی۔ پی کے مدقوق ڈرائیور کے باقی سب سو رہے تھے۔ باہر بڑی سردی تھی مگر کوٹھڑی کی فضا گرم اور حبس آلود تھی۔ اندر کچھ اس قسم کی بو تھی جیسے موبل آئل جل رہا ہو بستر میں لیٹنے کے کوئی آدھ گھنٹہ بعد بدبو ختم ہو گئی اور میں بھی اس کا ایک جزو بن گیا۔ مدقوق ڈرائیور بار بار کھانس رہا تھا۔ اس کی کھانسی کی آواز بڑی بھیانک تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اس کا دم نکل جائے گا۔ سبھی ڈرائیور زور زور سے خراٹے لے رہے تھے۔ گامی کے کلینر علی کے خراٹے تو آسمان کی خبر لا رہے تھے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے مجھے پرانے چیتھڑوں کے صندوق میں بند کر دیا ہے۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ اٹھ کر باہر آ گیا۔ باہر اگرچہ سردی تھی لیکن فضا بڑی شفاف اور ہوا تازہ تھی۔ سٹیشن پر سگنلوں کی سبز اور سرخ بیتاں خوب چمک رہی تھیں۔ میں سگریٹ سلگا کر ریلوے لائن تک گیا۔ چاند کہیں نہیں تھا۔ ستاروں کی دھیمی دھیمی روشنی میں لائن پار درختوں کے خاکے دھندلے دکھائی دے رہے تھے۔ شہر والی سڑک پر بتیاں جل رہی تھیں اور کبھی کبھی کوئی تانگہ گذر جاتا کچہری روڈ کے ہوٹل سے فلمی ریکارڈوں کے بجنے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔

مجھے اپنی بچھڑی ہوئی محبوبہ اختر کا خیال آ گیا۔ میں نے سوچا وہ اس وقت دہلی میں اپنے حوض قاضی والے مکان میں خاوند کے ساتھ گرم ہو کر لیٹی ہو گی۔ میرا دل ایک دم اداس ہو گیا اور میں نے ستاروں کی طرف آنکھیں اٹھا لیں۔ طبیعت بڑی دردمند اور رومانٹک ہو گئی

۔ دل انسان کی محبت اور ایثار سے بھر گیا۔ جی چاہا کہ شہر میں جاؤں اور جو کوئی شخص بستر اور لحاف کے بغیر سو رہا ہو اسے اپنا لحاف اوڑھا دوں ۔ اس خیال کے ساتھ ہی مجھے سردی محسوس ہونے لگی اور میں جلدی سے کوٹھڑی میں آ کر دروازہ اندر سے بند کر کے اپنے گرم لحاف میں دبک کر سو گیا۔ رات کے کسی لمحے جب مدقوق ڈرائیور امام دین کی کھانسی تیز ہو گئی تو خواجہ مینڈک نے پہلو بدل کر اسے موٹی سی گالی دی اور پھر خراٹے لینے لگا۔

پھاٹک والی مسجد میں صبح کی آذان ہوئی تو شیر گل ڈرائیور کلمہ پڑھتا ہوا اٹھا اور نماز پڑھنے کے لئے کوٹھڑی سے باہر نکل گیا۔ میں بھی اٹھ بیٹھا ۔ باٹا کے سفید بوٹ پہنے اور سیر کے لئے باہر چل دیا ۔ ان دنوں میں بڑی گرمجوشی سے صبح کی سیر کیا کرتا تھا۔ وہ گرمجوشی اب بھی قائم ہے لیکن یوں لگتا ہے جیسے اب وہ خوبصورت صبح نہیں ہوتی۔ اس طرح سورج سونے کی کرنیں لٹاتا ناشپاتی کے سفید اور پنک پھولوں سے لدے ہوئے درختوں کے اوپر سے طلوع نہیں ہوتا ۔ امرتسر میں آج سے کوئی پندرہ برس پہلے جب میں صبح صبح سیر کے لئے جایا کرتا تھا تو رام تلائی کے سامنے والی کچی سڑک کا چکر کاٹ کر کلکتہ جانے والی ریلوے لائن کے پھاٹک پر آ جاتا ۔ یہاں ایک جگہ ناشپاتی کا پیڑ سرسوں کے کھیت کے کونے پر ہوا کرتا تھا ۔ پوہ ماگھ کی برفانی ہواؤں میں ٹھٹھرتی صبحوں کو میں دیکھتا کہ اس درخت کی ٹہنیاں سیاہ پڑ گئی ہیں اور ان پر کہیں کہیں سرخ رنگ کے خزاں نصیب پتے لگے ہیں جن پر سے شبنم ٹپک رہی ہے۔ چیت ، بساکھ یعنی بہار کے مہینوں میں اس درخت کی ٹہنیاں سفید پھولوں سے لد جاتی اور جب ہوا چلتی تو گھاس پر پھول ٹوٹ ٹوٹ کر گرا کرتے۔

امرتسر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے کے بعد میں نے ایسا خوبصورت درخت پھر کہیں نہیں دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری صبح کی سیر میں پھر وہ گرمجوشی پیدا نہ ہو سکی۔ میں نے ہمیشہ پھولوں درختوں، کھیتوں ، شبنم ، صبح کی تازہ ہوا، طلوع ہوتے ہوئے سورج، چڑیوں کی چہکار، کھیتوں میں ہل چلاتے کسانوں اور صبح کی ہوا میں جھومتے درختوں کے لئے ہی صبح کی سیر کی تھی۔ معدے کا فعل ٹھیک کرنے کے لئے میں ایک بار بھی سیر کرنے گھر سے نہیں نکلا تھا۔ اور میرے معدے کا فعل کبھی خراب بھی نہیں ہوا۔ لاہور کے لارنس باغ میں ایک بار سیر کرنے گیا تو میں نے چاروں طرف معدوں ہی معدوں کو سیر کرتے، دوڑتے اور ورزش کرتے دیکھا تو گھبرا کر واپس گھر آ گیا اور پھر کبھی صبح کی سیر کا نام نہ لیا۔

اگرچہ ان دنوں امرتسر میرے پاس ہی تھا اور امرتسر والے مکان میں میری کتابیں ویسی کی ویسی پڑی تھیں، پھر بھی سرگودھے میں ناشپاتی کا ایک بھی پیڑ دکھائی نہ دیا۔ اس کے باوجود وہاں لائن کے پار سرسوں کے کھیت، آم کے درختوں کے جھنڈ اور صبح کی ایسی تروتازہ ہوا موجود تھی جسے کوٹھیوں سے اٹھنے والے دھوئیں نے ملوث نہ کیا تھا۔ میں ریلوے لائن پر آیا تو دیکھا کہ رات ہی رات میں تربوز کی قاش ایسا نیلا چاند آسمان کے مشرق میں نکل آیا تھا اور موٹے موٹے گہرے نیلے ستاروں کی سنگت میں خوب چمک رہا تھا ایک ستارہ تو بھڑک بھڑک کر کبھی نیلی اور کبھی سرخ لو دے رہا تھا۔ یہ صبح کا ستارہ تھا۔ سات ستاروں کی ٹولی یعنی کھتیاں درختوں کے سرمئی خاکوں کے اوپر آسمان پر چمک رہی تھیں، فضا بے حد نکھری ہوئی تھی اور ہر سانس کے ساتھ محسوس ہوتا گویا شبنم میں بھیگے ہوئے گلاب کی ٹھنڈی خوشبو پی رہا ہوں۔ ریلوے لائن پر چاند کی ہلکی نیلی روشنی میں اوس چمک رہی تھی۔

کچھ دور تک لائن کے ساتھ ساتھ چلنے کے بعد میں بائیں جانب کھیتوں میں اتر گیا۔ کچی پگ ڈنڈی پر چلتا میں کھیتوں میں کافی دور تک نکل گیا۔ مشرق میں آسمان پر صبح کی نیلی جھلکیاں نمودار ہو گئی تھیں اور ستارہ کچھ کچھ پھیکا پڑ گیا تھا۔ میں نے کھیتوں میں اگی ہوئی سرسوں پر دونوں ہاتھ پھیر کر شبنم اٹھائی اور اسے منہ پر اور آنکھوں پر ملنا شروع کر دیا۔ شبنم اتنی بھرپور تھی کہ میرے منہ پر سے اس کے قطرے ٹپکنے لگے اور اس کی لکیریں سی بہہ کر میری کہنیوں تک جا پہنچیں۔ میری آنکھیں گرم ہو گئیں۔ منہ ہاتھ ٹھنڈے برف ہو گئے۔ انگلیاں سن ہو گئیں اور دل بے معلوم، بے وجہ خوشی کے گہرے جذبے سے لبریز ہو کر چھلک اٹھا میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنا چہرہ سرسوں کے پودوں پر رکھ دیا انتہائی لطیف، انتہائی پاکیزہ، ٹھنڈی اور شبنم میں بھیگی ہوئی سبزے کی مہک میرے حلق میں سے اترنے لگی۔ میں سرسوں میں اور سرسوں مجھ میں گم ہو گئی۔ دونوں کے سانس مل گئے۔ من و تو کا امتیاز اٹھ گیا یہ تمیز کرنا مشکل ہو گیا کہ سبزہ کہاں ختم ہوتا ہے اور میں کہاں شروع ہوتا ہوں۔ گویا ماں نے بچھڑے ہوئے بچے کو بھاگ کر گلے سے چمٹا لیا تھا۔ سمندر کی لہر نے آگے بڑھ کر دوسری لہر کو سینے سے لگا لیا تھا پھول نے خوشبو کے اور روشنی نے سورج کے ہونٹ چوم لئے تھے۔ یہاں نہ کوئی مسجد کا مینار تھا اور سمندر کی گھنٹیاں تھیں اور نہ جھوٹی بے ثبات محبتوں کے دکھ تھے۔ یہاں صرف دھرتی ماتا تھی جس کی چھاتی سے اس کا بچھڑا ہوا لال چمٹا ہوا

تھا۔

سورج نے مشرقی افق پر سے اپنا سرخ چمکتا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا تو میرا چہرہ اس سے بھی سرخ اور چمکیلا ہو گیا۔ میرا منہ شبنم کے قطروں سے بھرا ہوا تھا اور شبنم کے ہر قطرے میں ایک ایک سورج طلوع ہو رہا تھا۔ یہ روشنی کے لعل تھے گودڑی کے لعل تھے، دھرتی کے لعل تھے۔ دل اوس میں بھیگا ہوا گلاب کا پھول تھا اور دماغ اس پھول کی شبنمی خوشبو بن کر صبح کی تازہ ہوا میں اڑا جا رہا تھا۔ نہ حسد کی دلدل تھی۔ نہ بغض کا کیچڑ تھا۔ نہ خود غرضی کی خاردار جھاڑیاں تھیں اور نہ ریاکاری اور مطلب پرستی کے بیمار مردہ۔ بے جان اور مدقوق سائے تھے۔ سرخ سورج کرنوں کا سونا لٹاتا اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا آ رہا تھا اور کھیتوں، پھولوں، کانٹوں مکڑیوں کے جالوں ریلوے لائن اور جنگلے کی آہنی تاروں پر شبنم کے موتی چمکنے لگے تھے، درختوں میں چڑیوں نے چہچانا شروع کر دیا تھا۔ امرود کے باغوں کی جانب طوطے ٹیں ٹیں کرنے لگے تھے۔ کسان کھیتوں میں بل لے کر چل نکلے تھے اور شہر کی گندی گلیوں میں لوگ لحافوں میں منہ سر لپیٹ کر پڑے تھے اور بدبودار سانس کے چکر میں پھنسے ہوئے تھے۔ سو رہو! سو رہو! ابھی صبح نہیں ہوئی اور ابھی سورج نہیں نکلا۔

میں واپس آیا تو کوٹھی کا دروازہ کھلا تھا اور سب ڈرائیور منہ ہاتھ دھو کر تیار ہو چکے تھے۔ باہر ایک دیگچی میں خواجہ بینڈک آگ جلا کر چائے ابال رہا تھا اور پیالوں میں بھر بھر کر ڈرائیوروں اور کلینروں کو دے رہا تھا۔ گامی باکسر سری پائے کھانے مچھری بازار چلا گیا تھا۔ میں نے دودھ کا پیالہ پی کر کپڑے پہن لیے۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد ڈرائیوروں نے اڈے میں سے لاریاں باہر سڑک پر نکالنا شروع کر دیں اس وقت میں رجسٹر لے کر پٹرول پمپ پر کھڑا تھا۔ جو لاری پٹرول ڈلوا کر نکل جاتی میں اس کا نمبر اور گیلنوں کی تعداد رجسٹر میں لکھتا جاتا۔ جب سب لاریوں میں پٹرول ڈلوایا جا چکا تو میں نے پرچی کاٹ کر پٹرول پمپ کے مالک کو دی اور خود آخری لاری میں بیٹھ کر اس مقام کی طرف روانہ ہو گیا جہاں ان پر روڑی اور بجری لادی جانے والی تھی۔

3

شہر سے باہر ویران سے اینٹوں کے بھٹوں کے قرب وجوار میں روڑی کے ڈھیر لگے تھے۔ کچھ مزدور ان ڈھیروں کے درمیان بیٹھے زیادہ پکی ہوئی بیکار اینٹیں توڑ توڑ کر ان کی روڑی بنا رہے تھے۔ خوشاب اور ماڑی انڈس کو جانے والی ریلوے لائن قریب ہی سے گزر رہی تھی۔ ریلوے والوں کا ایک ٹھیلہ جا رہا تھا۔ دو قلی لائن پر دوڑتے ہوئے اسے دھکیل رہے تھے۔ بڑی سی سرخ چھتری کے نیچے ٹھیلے کے بنچ پر سفید ہیٹ والا کوئی افسر فائلیں گود میں لئے بیٹھا تھا۔ کچی سڑک کے ساتھ ساتھ شہتوت کے چھوٹے چھوٹے درختوں کی پتیاں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ میری لاری کا ڈرائیور خواجہ بینڈک اپنی سیٹ سے اتر کر نیچے سگریٹ پینے لگا اور چاروں طرف نظریں گھما کر بولا۔

"بٹ جی! معلوم ہوتا ہے ان لوگوں کے بھٹے بیٹھ گئے ہیں"۔

ادھر کلینر مزدوروں کے ارد گرد منڈلا کر انہیں جلدی جلدی روڑی لادنے کا حکم دے رہے تھے۔ مزدور بیلچوں سے روڑی اٹھا اٹھا کر ٹوکریوں میں بھر رہے تھے اور لاری میں پھینکتے جا رہے تھے۔ خواجہ بینڈک اپنی ہی دھر پدالاپ رہا تھا۔

"میری گاڑی سب سے زیادہ پٹرول کھاتی ہے۔ بٹ جی، آپ خود ہی دیکھ لیں گے

۔

آٹھ گیلن ڈلوایا ہے ناں۔ بس پھر چھٹے پھیرے تیل مانگنے لگے گی یہ بہن کی

یار۔۔۔۔۔۔۔"

مجھے سردار خاں کے وہ نکتے یاد آگئے جو اس نے مجھے گزشتہ رات ڈرائیوروں کی چال بازیوں کے بارے میں سمجھائے تھے

میں نے کہا۔

"میری طرف سے چاہے جتنا تیل ڈلوالو خواجہ۔ میں تمہارے حساب میں ڈال دوں گا"۔

خواجہ نے زور سے چٹکی مار کر سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر کہا۔

"یہی تو مصیبت ہے۔ اچھا بٹ جی یہ بتائیں یہ حساب کتاب کس بہن یاوے نے ایجاد کیا تھا؟"

افسوس کہ مجھے حساب کتاب کے موجد کا نام معلوم نہیں تھا۔

جہاں ہوائی اڈہ بن رہا تھا اس مقام کا نام دھپ سڑی تھا۔ نام انتہائی غیر رومانوی تھا لیکن جگہ بڑی رومانوی تھی۔ اس اعتبار سے کہ وہاں روشن بڑی موٹی موٹی آنکھوں اور فراخ کولھوں والی مزدور لڑکیاں کام کر رہی تھیں۔ دھپ سڑی اب ٹھیک طرح سے یاد نہیں شہر سے کوئی آٹھ دس میل کے فاصلے پر تھی۔ لاری شہر کے بازاروں میں سے گزر کر بڑی سڑک پر آ گئی۔ راستے میں کچے کچے کوٹھوں اور گندے گندے بچوں اور غلیظ دوکانوں والے چند ایک دیہات آئے۔ چاروں طرف کھیتوں میں سرسوں پھول رہی تھی کہیں کہیں کماد کے کھیت بھی تھے اور کہیں گنا پیلا جا رہا تھا۔ راستے میں ہمیں اپنی دو تین لاریاں ملیں جو روڑی پھینک کر واپس شہر جا رہی تھیں۔ آمنے سامنے سے گزرتے ہوئے دونوں ڈرائیوروں نے ایک دوسرے کو ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ خواجہ ہینڈک نے سلام کرنے کے بعد ہنس کر مجھے کہا۔

"اس گامی سالے نے ضرور سواریاں بٹھائی ہوں گی۔ رات کو چار پانچ ضرور بٹھالے گا۔ مگر بٹ جی حلال کی روزی کا انڈیا میں جواب نہیں۔ بس جی ہم تو یہ جانتے ہیں کہ حلال کی سوکھی روٹی بے ایمانی کے پراٹھے سے ہزار درجے بہتر ہے"۔

پھر گیئر بدل کر انجن کو پٹرول زیادہ دے کر بولا۔

"پھر پلگ کام نہیں کر رہا۔ یہ گاڑی بھی بہن یاوی حرام کی کمائی کی معلوم ہوتی ہے"۔

ہوائی اڈے پر بڑی چہل پہل تھی۔ بلڈوزر چل رہے تھے۔ سٹیم رولر سڑک کوٹ رہے تھے۔ مزدور کڑائیوں میں بجری ملا گیلا سیمنٹ پھینکتے جا رہے تھے۔ ماشکی پانی کا چھڑکاؤ کر رہے تھے۔ چھ سات مشینیں سیمنٹ میں بجری ملا کر مسالہ تیار کر رہی تھیں۔ ٹھیکیدار کا طرہ اوپر سے تازہ گڑ بھی نکال کر کھا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ کام کرنے والی مزدور لڑکیوں سے مذاق بھی کر رہا تھا۔ ان دو تین لڑکیوں میں ایک لڑکی بڑی پیاری تھی۔ اس نے گھگری پہن رکھی تھی۔ چولی کے نیچے سانولا پیٹ صاف نظر آ رہا تھا اور اوپر کسی ہوئی چھاتیاں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ خراس کے سانڈ کی آنکھوں پر کھوپے چڑھے ہوئے ہیں۔ یہ لڑکی بھی اور سیتر

کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور جب سیمنٹ سے بھری ہوئی کڑاہی اٹھا کر چلتی تو بڑی ادا سے کولہے کو ذرا خم دیتی۔ اور سیٹر دھڑادھڑ گڑھانا شروع کر دیتا۔

پہلے ہی روز اس لڑکی پر ہمارے سارے ڈرائیور اور کلینر عاشق ہو گئے اور رات کو ہاتھ مل مل کر اس کے جسم کے خم و پیچ بیان کرنے اور آہیں بھرنے اور ایک دوسرے کو گالیاں بکنے لگے۔

"خواجہ تم اپنی شکل تو دیکھو۔ معلوم ہوتا ہے مینڈک بیمار ہو گیا ہے اور چلے ہو اس لونڈی سے عشق کرنے۔ اوئے در فٹے منہ تیرا حلوہ کدو کی اولاد۔"

خواجہ مینڈک نے منہ پر ہاتھ رکھ کر ایک زور دار بھڑک ماری اور بولا

"میرے مولا نے چاہا تو میں تم سب سے پہلے اس بملا کماری کی ربڑی بناؤں گا"۔

گامی نے منہ سے بکری ایسی آواز نکال کر کہا۔

"خواجہ بکری ہو جاؤ گے بکری-----------"

"مدقوق ڈرائیور جو بڑے مزے سے یہ مناظرہ سن رہا تھا مونچھوں نے پر انگلی پھیر کر کہا۔

"کیوں نہیں راجگورو سے انصاف کروا لیتے؟"

راجگورو نے لمبی ناک سے دو بار سوں سوں کر کے کہا۔

"میں اس لڑکی سے پوچھ کر بتاؤں گا"۔

مدقوق ڈرائیور نے ہنس کر کہا۔

"وہ تو پھر کسی کے پاس بھی نہیں جائے گی"۔

خواجہ مینڈک خچر کی طرح ہنہنا کر کہنے لگا۔

چپ کر نی چھبی اٹھتی (2638) اچھا بھئی راجگورو تو منصفی کر اور بتا کہ وہ سالی کیا میری بغل گرم نہیں کرے گی؟"

راجگورو کھنگار کر بولا۔

"میرا خیال ہے کہ اسے سوائے اور سیٹر کے اور کوئی نہیں پھانس سکتا"۔

"کیوں جی۔ خواجہ نے بھڑک کر کہا۔" اس کے پاس کوئی گیدڑ سنگھی ہے؟ کیا منصفی کی ہے میرے راجگورو نے۔ ارے واہ رے میرے چندر موہن"۔

گامی کہنے لگا۔

"بس میں آج ہی ڈرائیوری چھوڑ کر اور سئیر ہو جاتا ہوں"۔

خواجہ نے مٹھی گھما کر کہا۔

"ارے تیرے جیسے ان پڑھ آدمی کو تو کوئی اپنے دفتر کے پاس بھی نہیں بھٹکنے دے گا۔ تجھ سے تو میں ہی اچھا ہوں کم از کم اپنا نام تو لکھ لیتا ہوں۔"

نہیں بھئی یہ بات نہیں۔ سٹے کی پرچی تو گامی بھی پڑھ لیتا ہے"۔

"گامی باکسر مونچھوں پر لگے ہوئے تیل کو دھوتی کے پلو سے رگڑ کر بولا۔

"زنانی مردار سے کبھی عشق نہیں کرتی خواہ وہ ایم اے پاس ہو وہ تو گھبرو جوان پر مرتی ہے۔ جیسے میں ہوں"۔

"واہ میرے لِکر پہلوان"۔

"اشکے میری بملا کماری"۔

"اوئی میری چھمی اٹھنی"۔

"ہٹ کے بدھو۔ ہٹ کے بدھو"۔

"ہٹ کے بدھو۔ ہٹ کے بدھو"۔

گامی باکسر اور خواجہ بینڈکٹ نے پیٹھ سے پیٹھ جوڑ کر بھنگڑا ڈالنا شروع کر دیا۔ راجگرد اور مدقوق ڈرائیور اپنی اپنی چارپائیوں پر ہنستے رہے۔ شیر گل اپنے بچھونے پر اکڑوں بیٹھا وظیفہ کر رہا تھا۔ اس وقت تک وہ بالکل خاموش تھا۔ لیکن جب کوٹھڑی میں بھنگڑا ڈالا جانے لگا تو اس نے تسبیح والا ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"کنجرو! کوئی خدا کا خوف کرو"۔

خواجہ بینڈکٹ اور گامی باکسر نے شیر گل کی طرف دیکھ کر مرغ بن کر آذان دی اور پہلے سے بھی زیادہ تیزی سے ناچنے لگے۔

"بغل میں لونڈا منہ میں رام رام"

"ہٹ کے بدھو۔ ہٹ کے بدھو"۔

اپنی چارپائی پر لحاف میں دبک کر لیٹا پہلے تو میں ان ڈرائیوروں کی خرمستیوں کا لطف اٹھاتا رہا۔ لیکن پھر ایک دم اداس دلگیر سا ہو گیا۔ یوں محسوس ہوا گویا میں اختر سے بچھڑنے

کے بعد سرکس والوں کی منڈلی میں شامل ہو گیا ہوں اور میرے ارد گرد ماہر بازی گر اور ہاتھی گھوڑے اچھل کود مچا رہے ہیں۔ راجگورو کی حیثیت اس وقت سرکس میں سدھانے والے ماسٹر یعنی رنگ لیڈر کی تھی۔

ہمارے سامنے والے میدان میں دن بھر لاریاں گھوم گھوم کرتی چکر لگایا کرتیں۔ کبھی دیوار کے ساتھ پیچھے ہٹتی جاتیں اور کبھی عین بیچ میں آ کر کھڑی ہو جاتیں۔ ان کا ورکشاپ بھی وہیں پاس ہی تھا۔ تیل بھرے ہوئے مکینک دن بھر پرزوں کی مرمت کیا کرتے، کوئی گدی بچھا کر موٹر کے نیچے گھس کر ٹھک ٹھک شروع کر دیتا۔ کوئی بونٹ کھول کر اس پر جھک جاتا۔ دوسری جانب پھٹے ہوئے ٹائروں کو مشین کے ذریعے نئے پیوند لگائے جا رہے ہوتے۔

نوعمر کاریگر پرزوں کو پٹرول سے دھو کر صاف کرنے اور اچھل اچھل کر ٹیوبوں میں ہوا بھرنے میں مگن ہوتے۔ میدان میں صبح سے شام تک ہلکی ہلکی گرد اڑا کرتی۔ شام کو یہ گرد مکانوں کے دھوئیں اور رات کے بڑھتے ہوئے اداس اندھیرے سے گھل مل کر میدان کے اوپر معلق ہو جاتی۔ معلوم ہوتا کہ یہ اندھیرے اور دھوئیں کا بادل اب کبھی اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا۔ اس کا احساس مجھ پر ایک درد انگیز غم طاری کر دیتا۔ میرا دل بوجھل ہو جاتا اور یوں لگتا جیسے میں آہستہ آہستہ موت کے قریب ہوتا جا رہا ہوں۔ صبح کی تازگی میں جو کھلی فضا میرے لئے پیام زندگی لاتی۔ شام کو وہی فضا مجھے موت کا خوف دلا دلا کر ہراساں کرنے لگتی۔ میں کسی ہوٹل میں چھپ کر بیٹھ جاتا اور چائے کی پیالی سامنے رکھ کر اس خیال سے دل کو تسلیاں دیا کرتا کہ کل پھر صبح ہو گی۔ کل پھر صبح ہوتی تو میں بڑی گرمجوشی کے ساتھ سیر کو نکل جاتا اور اوس میں بھیگے ہوئے پھول پتوں، تازہ ہوا اور طلوع ہوتے ہوئے سنہری سورج کی روشنی کو دیکھ کر زندگی کا بھرپور احساس ہوتا اور معلوم ہوتا کہ میں ایک بار پھر جنم لے رہا ہوں۔

ہمارے ڈیرے میں صرف گامی باکسر ہی کبھی کبھی شراب پیتا تھا۔ خواجہ بینڈک کو شراب سے اس لئے نفرت تھی کہ وہ اسے ہضم نہیں ہوتی تھی۔ دو ایک بار جب اس نے کوشش کی تو اسے قے ہو گئی اور وہ شراب اور اپنی قسمت کو گالیاں دیتا باہر نکل گیا۔ گامی باکسر باہر سے شراب پی کر آتا تھا اور وہ بک بک کرتا کہ ہر وقت ٹر ٹر کرتے رہنے والا خواجہ بینڈک بھی چلا کر بول اٹھتا۔

"گامی تم نے شراب پی ہے کہ کوے کھا لئے ہیں۔ کیا نوے میل کی سپیڈ پر زبان چل رہی ہے"۔

ڈرائیوروں کا دوسرا ڈیرہ کچہری بازار کی ایک گلی میں تھا۔

دو کانوں کے اوپر ایک لمبا چوڑا کمرہ تھا۔ جس کے اوپر کچے فرش والا کوٹھا تھا اور بس۔ اس کمرے میں ڈرائیوروں نے چارپائیاں ڈال کر اوپر اپنے بستر جما رکھے تھے۔ انگیٹھی پر کڑوے تیل کی دو تین بوتلیں۔ ٹوٹے ہوئے لکڑی کے فریم والے آئینے اور دو عدد موچنے پڑے تھے۔ باہر چھوٹا سا آنگن تھا۔ پمپ لگا تھا۔ اوپر جانے والی سیڑھیوں کے سائے میں چولہا بنا تھا۔ یہاں یہ لوگ خود ہی اپنا کھانا بناتے، چائے پکاتے اور یوں کفایت شعاری کرتے تاکہ پیچھے گھر اپنے بیوی بچوں کو منی آرڈر کر سکیں۔ شراب پی سکیں اور رنڈیوں کے بازار کی سیر کر سکیں۔ رات کو اکثر ڈرائیور میرے ڈیرے پر آ کر ہی پھیرے لکھوا دیتے۔ اگر کوئی کسی وجہ سے نہ آتا تو میں فوراً اس ڈیرے پر آ جاتا۔

یہاں بھی وہی رنگ جما ہوتا۔ یہاں بھی لوگ ویسی ہی باتوں اور حرکتوں میں مشغول ہوتے جیسی باتیں میرے ڈیرے والے ڈرائیور کیا کرتے تھے۔ ان سب کی باتیں اور عادتیں اس قدر ملتی جلتی تھیں کہ وہ مجھے ہم شکل دکھائی دینے لگے تھے۔ اس ڈیرے میں دتہ لنگڑو ڈرائیور تھا۔ یوسی پھینا ڈرائیور تھا۔ کوبی لفتہ کلینر تھا حسو ڈرائیور تھا جس کے منہ پر نسواری تل ہی تل تھے اور جو ہر وقت جیب میں چاقو رکھتا تھا۔ اس چاقو سے وہ مسواکیں کاٹتا اور لونڈیوں کو ڈرا دھمکا کر اپنے ڈیرے کی چھت پر لے جاتا۔ یوسی پھینا شراب کا متوالا تھا۔ وہ ہر روز ڈیرے میں شراب کا ادھا لے آتا اور پی کر وہ ادھم مچاتا کہ باقی سارے ڈرائیور خوش ہو کر واہ واہ کے ڈونگرے برسانے اور ناچنے لگتے۔ جب وہ شراب کے نشے میں دھت ہو کر گر پڑتا اور بے سدھ ہو جاتا تو حسو اور دتا لنگڑو اسے اٹھا کر چارپائی پر ڈال دیتے اور اس کے سارے کپڑے اتار کر اسے الف ننگا کر کے اسکی پیٹھ پر موبل آئیل مل کر لحاف ڈال کر سلا دیتے اور صبح اسے طرح طرح کے فحش مذاق کرتے۔

جس روز یہ رنڈیوں کے بازار میں جاتے تو ان کی سج دھج ہی نرالی ہوتی۔ بالوں میں تیل ڈال کر کنگھی کر کے مانگ نکالی ہوتی۔

گھر سے تھوڑی تھوڑی شراب پی کر چلتے۔ جیب میں چاقو اور روپے بڑی احتیاط سے

رکھے جاتے۔ رنڈیوں کا محلہ شہر سے باہر نہر پار آباد تھا۔ ایک لمبی سی قطار میں کچھ بے ڈھنگے سے ایک منزلہ سے مکان تھے۔ ان مکانوں کی دہلیزوں میں موڑھوں اور پلنگڑیوں پر بنی سنوری پکی عمروں کی اور جوان رنڈیاں بیٹھیں مسکرا مسکرا کر اشارے کر رہی ہوتیں۔ ان کی صورت دیکھتے ہی ڈرائیور بکروں کی طرح خرخرانے لگتے اور گندے گندے فقرے بول کر پھر خود ہی ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر زور زور سے قہقہے لگاتے۔ ہر رنڈی کے پاس جا کر بات کرتے اور مذاق کرتے اور اسے بتاتے کہ ہم امرتسر سے آئے ہیں۔ جہاں کی ہر رنڈی سلوچنا سے کم نہیں۔ یہاں کی دیہاتی رنڈیاں ان امرتسری ڈرائیوروں کی آن بان دیکھ کر بڑی مرعوب ہوتیں۔ یہ لوگ بازار میں ہر دکان پر سے پان سگریٹ خریدتے۔ جگہ جگہ کھڑے ہو کر ترچھی نظروں سے رنڈیوں کو دیکھتے اور لمبے لمبے کش لگاتے۔

گامی باکسر کا روز کا معمول تھا کہ وہ لاری کو اڈے میں کھڑی کر کے منہ ہاتھ دھو کر سیدھا رنڈیوں کے بازار کا رخ کرتا۔

وہاں سے فارغ ہو کر وہ تنور سے روٹی کھاتا۔ ہوٹل میں چائے پیتا اور منہ میں پان دبا کر سگریٹ پیتا ماہیا گاتا واپس ڈیرے پر آتا۔ شہر سے ہوائی اڈے اور وہاں سے واپس شہر کے پھیرے لگاتے ہوئے وہ دیہاتی سواریوں کو بٹھا لیا کرتا اور یوں چھ سات روپے بنا لیتا جنہیں وہ رنڈیوں کی نذر کر دیتا۔ صبح اٹھ کر وہ تیل کی مالش کرتا اور ایک سو ڈنڑ لگاتا۔ رات کو رنڈیوں کے ہاں جانا۔ صبح کو ڈنڑ لگانا اور ہر تیسری روز اپنی بیوی کو امرتسر مجھ سے خط لکھوانا وہ کبھی نہیں بھولتا۔ کبھی کبھی یوسی پھنیے کے ڈیرے پر جا کر شراب کی چسکی بھی لگا لیتا۔ رات کو جب وہ کبھی بڑبڑاتا تو اس کے منہ سے پپو کا نام نکل جاتا۔ پپو اس کا دو سالہ لڑکا تھا۔ جس سے اسے بڑا پیار تھا۔

یوسی پھینا شراب کے نشے میں چور ہو کر عام طور پر اپنے سسر کو گالیاں دیا کرتا کیونکہ اس نے یوسی کو ایک بار چار سو روپے کا قرض نہیں دیا تھا۔ اور اسے یہ رقم ایک پٹھان سے پچیس روپے سینکڑہ کے حساب سے لینی پڑی تھی۔ پھر وہ اپنی بیوی کو بھی واہی تباہی بکنے لگتا اور اس کے بارے میں ایسی واہیات باتیں کرتا کہ دتا لنگڑو اور حسو ایسے چھٹے ہوئے بھی کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے۔

"کیوں اس بے چاری کو نشتر کر رہے ہو؟"

"بک بک نہ کر اوئے ---------- میں ساری شراب ---------
بک --------- میں اس کی ماں کو ------------"

کوبی لفتہ کلینر فیروز پور کی کسی رنڈی کو دل دے بیٹھا تھا۔ وہ دوسرے لوگوں سے چھپ کر اپنی منی جان کو محبت بھرے خط لکھوایا کرتا۔ اس منی جان کا نام ممتاز تھا۔ اور وہ اسے کبھی بھی خط کا جواب نہیں دیتی تھی۔ مگر یہ عاشق صادق ہر چوتھے پانچویں روز اس کے نام ایک مسرت نامہ ڈاک کے سپرد کر دیتا۔ جب میں نے اسے کہا کہ جب ممتاز اسے جواب نہیں دیتی تو وہ اسے خط کیوں لکھے جاتا ہے۔

کوبی نے آہ بھر کر اپنی پچکی ہوئی گال پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔

"بٹ جی! فرہاد کا کام کلہاڑا چلانا ہے۔ مجنوں کا کام لیلیٰ کا نام لے لے کر گانے گانا ہے، ایک دن تو لیلیٰ بھی تڑپ اٹھے گی۔ کبھی ہماری فریاد بھی مولا سن لے گا۔"

کوبی بڑا زیرک عاشق تھا۔ جب میں کوئی جملہ اپنی طرف سے لکھ دیتا تو اس کا اصرار ہوتا کہ میں اسے کاٹ دوں۔

"مگر یہ جملہ تو بڑا محبت بھرا ہے"۔

"ٹھیک ہے بٹ جی۔ مگر آپ میری ممتاز کو نہیں جانتے میں جانتا ہوں کہ اس سے کس طرح بات کرنی چاہیے۔ اور اس کے دل پر کس بات کا اثر ہوتا ہے۔ آپ یہ جملہ لکھئے ---- میری ممتاز جی! ہم تو تمہارے عشق میں دیوانے ہو گئے ہیں اور تم کو خبر ہی نہیں جی؟ ہیں جی؟ میں نے کہا جی ذرا ادھر بھی دیکھو جی! ----"

میں نے پوچھا۔

"اور کچھ جی"۔

"ہیں جی؟ ---------- کوبی چونک کر پوچھتا" ہاں جی!

اور لکھیں کہ میری سلوچنا عرف ممتاز زیرے والی جی!

میں اب فل ڈرائیور ہو گیا ہوں جی۔ بڑی فل سپیڈ پر گاڑی چلاتا ہوں ۔ پی۔ بی۔ ایل 3512 اپنے پاس ہے پٹرول کم کھاتی ہے۔ بڑی دوڑتی ہے، پچھلی بتیاں بھی جلتی ہیں۔

ممتاز جی! کیا اب بھی مجھے شربت وصل نہیں پلاؤ گی؟

اری ظالم پورا پیالہ نہ سہی ایک گھونٹ ہی پلا دو ----"

میں بات کاٹ کر کہتا۔

"مگر کوبی بی۔ پی۔ ایل 3512 تو جلال چلاتا ہے اور تم ابھی کلینر ہو۔ تم اسے جھوٹ کیوں لکھ رہے ہو؟"

کوبی اپنی ران کھجاتا اور طوطے کی طرح مسکرا کر گردن گھما کر کہتا۔

"بٹ جی عشق سچا ہو تو جھوٹ بھی سچا ہو جاتا ہے"۔

سردار خاں نے اپنے کمرے میں ایک الگ محفل جما رکھی ہوتی تھی۔

سردار خاں خود تو شراب نہیں پیتا تھا مگر اس کا ساتھی جلال شراب کا رسیا تھا۔ جلال شراب منگوا کر کمرے میں بیٹھ جاتا۔ صوفی حالت میں وہ بڑا کم سخن تھا۔ مگر شراب پی کر وہ طوطے کی طرح باتیں کرنی شروع کر دیتا۔ وہ اپنے گاؤں اور گاؤں کے گدھوں کو یاد کرتا۔

"خاں جی! گدھوں میں رہ کر میں بھی گدھا ہو گیا تھا۔ مگر بڑے مزے کے دن تھے۔ حقہ پیتا تھا۔ باجرے کی روٹی گڑ کے ساتھ کھاتا اور رات کو مزے سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر سو جاتا۔ نہ کوئی غم تھا نہ کوئی فکر۔۔۔۔۔۔ شراب کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ نام ضرور سن رکھا تھا۔ اب مرغ کھاتا ہوں شراب اڑاتا ہوں۔ کریون اے کے سگریٹ پیتا ہوں۔ لیکن دماغ چکروں میں پھنس گیا ہے۔ کبھی گاڑی کی فین بیلٹ ٹوٹ جاتی ہے۔ تو کبھی ڈائنمو خراب ہو جاتا ہے۔ پٹرول کا جمع خرچ ہے۔ حصے کی بک بک ہے۔

رجسٹروں کی بھرمار ہے۔ طرح طرح کے ٹیکس ہیں۔ نئی نئی باتیں ہیں۔ نئے نئے چکر ہیں۔ نئی نئی زنجیریں ہیں۔ دل کو سکون نہیں خاں جی! تنگ آ کر شراب پیتا ہوں۔ بیوی کا خرچ مجھ سے دوگنا ہو گیا ہے۔ دو عدد داشتائیں رکھی ہیں۔ ان کے اخراجات الگ ہیں۔ دوسری شادی کرنے کو پھر رہا ہوں۔ تم دیکھ لینا میرا انجام یہی ہو گا کہ ایک دن شراب پی پی کر ختم ہو جاؤں گا۔ گردے میں درد رہنے لگا ہے۔ گیارہ روپے کی ہر ہفتے گولیاں آتی ہیں۔ جسم میں کمزوری محسوس کرنے لگا ہوں۔ بیوی کے پاس جانے کو دل نہیں چاہتا۔ داشتاؤں سے جی بھرنے لگا ہے۔ طبیعت نئی نئی خواہش کرتی ہے۔ اور جسم جواب دے رہا ہے۔ اگر گاؤں میں گدھے ہی چلا رہا ہوتا تو شاید باجرے کی روٹی کھا کر اور نہر کا پانی پی کر ساٹھ ستر سال تک زندہ رہ لیتا۔ لیکن کریون اے کے سگریٹ، مرغ، نئی گاڑی اقتصادی خوش حالی اور کمپنی کی بک بک مجھے پچاس سے پہلے پہلے ہی قبر میں لے جائے گی۔۔۔۔۔۔"

سردار خاں اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہتا ہے۔

"پترا ابھی تو ایک ہی گاڑی ہے۔ ذرا دو تین گاڑیاں اور آجانے دو پھر پوچھوں گا کہ کس بھاؤ بک رہی ہے؟"

"خدا کے لئے میری یہ گاڑی بھی تم ہی لے لو۔ جاؤ آج سے پینتیس بارہ کے تم مالک ہو۔ جاؤ کہہ جو دیا"۔

"ارے جا بڑا آیا شاہو کار۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سالو! میں تم شرابیوں کی ایک ایک رگ سے واقف ہوں۔ پندرہ سال سے تم لوگوں میں رہ رہا ہوں"۔

پھر وہ زور سے لڑکے کو آواز دیتا۔

"چل بے لڑکے! حقہ تازہ کر کے لے آ۔"

"یار خاں تم حقہ کیوں پیتے ہو۔؟ یہ کریون اے میں نے کس خنزیر کے لئے لے رکھے ہیں۔ یہ بھی تو تیرے بھائی کا مال ہے تو میرا بڑا بھائی ہے لے خدا کی قسم بے شک پٹواری بلا کر لکھت پڑھت کروا لے۔ تو آج سے میرا بڑا بھائی ہے۔ ارے ظالم اب تو کریون اے کا سگریٹ پی لے۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"چلو پی لیتے ہیں۔ پترا تو بھی کیا یاد کرے گا"۔

"وہ لڑکا ابھی تک نہیں آیا خاں جی! وہ لڑکا کہاں چلا گیا۔ بڑا بھولا بھالا لڑکا ہے۔ خاں جی چٹنی ختم ہو گئی ہے"۔

"منگواتا ہوں۔"

"خاں جی شراب بھی اور منگوانی ہے۔ شراب بھی ختم ہو گئی ہے"۔

"بس کر جا لے اب بس کر"۔

"نہیں خاں جی تم میرے بڑے بھائی ہو۔ بڑے بھائی ہو کر ایسی باتیں کرتے ہو۔ میں شراب منگوا رہا ہوں۔ کباب نہیں منگوا رہا"۔

"اب بکواس بند کر اور لیٹ کر سو جا"۔

"خاں جی! شراب ختم ہو گئی ہے۔ بڑے بھائی ہو کر مجھے یہ کہہ رہے ہو کہ جا سو جا۔ مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔ تم بھائی نہیں قصائی ہو۔ میں تمہارے اس سلوک کو کبھی نہیں بھولوں گا"۔

"جا لے اب چپ کر جا طوطے دیا پترا"۔

"میں طوطا ہوں خاں جی؟ نہیں نہیں-----۔ میں تمہارا چھوٹا بھائی ہوں۔ میں تو گدھا ہوں، چھوٹا گدھا ہوں، شراب ختم ہو گئی ہے خاں جی۔ بھرا جی------ہک-----۔ مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔ بڑے بھائی جی------۔ میں طوطا نہیں ہوں۔ پھر تم نے مجھے طوطا کیوں کہا۔؟--------۔"

پھر وہ گانا شروع کر دیتا ہے۔

"ہوواں طوطا
میں اڈ جاواں
جنگل دی سیل کر آواں------ہک------۔"

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

4

گامی باکسر کے پہلوان نما کلینر نے کچھ دنوں سے رات کو چارپائی پر لیٹے لیٹے ماہیا گانا شروع کر دیا۔ گامی نے ایک روز اسے موٹی سی گالی دے کر کہا۔

"تو نے یہ دھرید کیوں گانا شروع کر دی؟"

معلوم ہوا کہ اس کی بیوی کو اس کے ماں باپ نے گھر بلالیا ہے اور اب اسے واپس نہیں بھیج رہے۔ کلینر نے یہ خفیہ بات صرف مجھے بتائی۔ پھر بڑی عاجزی سے کہنے لگا۔

"بٹ جی آپ کوبی کے بھی خط لکھا کرتے ہیں۔ ایک خط میری طرف سے میرے سسر کو بھی لکھ دیں"۔

"کیا لکھوں؟"

کلینر نے آہ بھر کر کہا"۔

اسے لکھئے کہ

لام لمیاں راہواں تے جان والی
ساڈے دل کا حال نہ پچھیا توں؟"

میں نے کہا۔

"کیا تم یہ اپنے سسر کو مخاطب کر کے لکھواؤ گے؟"

"ایک ہی بات ہے جی سسر کیا اور بیوی کیا۔ سچی بات پوچھتے ہیں تو مجھے تو چاروں طرف اپنی رانو ہی رانو دکھائی دیتی ہے۔ بٹ جی ہم آپ کے پتر ہیں۔ بس ایک خط لکھ دیں۔ ایسا خط ہو کہ جسے پڑھ کر میرا خسر فوراً رانو کو میرے پاس بھیج دے۔ ہائے ظالم لوگوں نے کیسا ظلم ڈھایا کہ شادی کے چار ماہ بعد ہی بیوی کو مجھ سے جدا کر دیا۔

ہائے بٹ جی! یہ شیریں کے شہر کے لوگ اتنے ظالم کیوں ہوتے ہیں؟"

اس رات میں نے چارپائی پر بیٹھ کر پہلوان کلینر کے سسر کے نام ایک بڑا جذباتی اور پر درد خط لکھا۔ دوسرے دن پہلوان نے خط کو چوم کر اور دعا پڑھ کر پوسٹ کر دیا۔ ایسا اتفاق ہوا کہ اس خط کا سچ مچ بوڑھے خسر پر اثر ہو گیا۔ چار دن بعد پہلوان کو خط آیا کہ آ کر مل

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

جاؤ۔ پہلوان کی جان میں جان آ گئی۔

"بٹ جی خیر ہووے! کچھ ہو گیا! ہائے رانو جی تسی کب میری چھاتی سے لگو گے؟

پہلوان چلا گیا۔ تین روز بعد واپس آیا تو چہرہ کھلا ہوا تھا۔ آتے ہی میرے گھٹنے پکڑ لیئے۔

"مان گئے ہیں گورو جی! تسی ہمارے گورو ہو"۔

"کیا ہوا؟ کام بن گیا کیا؟"

پہلوان کلینر نے میرا ہاتھ چوم کر کہا۔

"صدقے جاؤں ان انگلیوں کے۔ ایسا قلم چلایا کہ رانو میرے ساتھ گھر آ گئی؟"

"سچ؟"

"بالکل سچ بٹ جی۔ تین دن رانو کے ساتھ ہی بیٹھا رہا ہوں"۔

"تو لاؤ مٹھائی"۔

"تسی کہو تو سرگودھا شہر میں حلوائی کی دکان آپ کو کھلوا دوں۔ مگر ذرا کان میں سنو گورو جی ---------- یہاں کسی کو خبر نہ ہو ہاں۔ نہیں تو مٹھائی کھلا کھلا کر اپنا دیوالہ نکل جائیگا۔"

اور کلینر آنکھیں میچ کر خوب ہنسا۔

بقرا عید پر ہم سب لوگ دو دنوں کے لئے چھٹی پر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ واپس آئے۔ بمشکل دو روز ہوئے تھے کہ شام کے وقت میدان اور لائن کے ساتھ ساتھ چرتی ہوئی بکریوں میں سے ایک بد نصیب بکری چرتی چراتی ہماری کوٹھڑی کی طرف آ گئی۔ اس وقت شیر گل نماز پڑھنے پھاٹک والی مسجد میں گیا ہوا تھا۔ راجگورو باہر چولہے پر دیگچی رکھے ماش کی دال پکا رہا تھا۔ گامی باکسر آگ کے پاس چولہے کے سامنے بیٹھا اس رنڈی کی یاد میں گم تھا جس کے پاس سے وہ ابھی ابھی ہو کر آیا تھا۔ میں بستر میں لیٹا کتاب پڑھ رہا تھا۔ بکری کو جانے کیا سوجھی کہ آنگن میں چکر کاٹنے کے بعد دہلیز کو سونگھتی کوٹھڑی کے اندر داخل ہو گئی ۔ گامی باکسر نے راجگورو کو آنکھ ماری اور بولا۔

"مال اپنے آپ آ گیا ہے۔"

خواجہ ہینڈکک نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا۔ جھٹ منہ ہاتھ پونچھتا آ گیا اور جلدی سے

کوٹھڑی کا دروازہ بند کر دیا۔

"بکری جانے نہ پائے گامی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم نے اس بار قربانی نہیں دی"۔

راجگورو نے کہا۔

"کسی کو پتہ چل گیا تو بڑی بدنامی ہو گی"۔

خواجہ بینڈک بولا

"تم چپ رہو خواجہ خضر کی اولاد۔ خدا نے خود اسے ہمارے پاس بھیجا ہے"۔

چنانچہ یہی ہوا۔ بکری میرے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور ممیانے لگی۔ خواجہ نے کوٹھری کا دروازہ بند کر دیا اور اندر آ کر کہنے لگا۔

"بٹ جی اب یہ اپنا ہی مال ہے۔ پہلے اس کا دودھ تو پیئں"۔

دیکھا تو معلوم ہوا کہ ابھی پٹھی ہے اور دودھ نہیں اترا۔ خواجہ نے باہر جا کر گامی سے کہا۔

"گامی! یار ابھی تو اس بکری کی شادی بھی نہیں ہوئی"۔

"کیوں؟ کیا اس نے نتھنی پہن رکھی ہے؟"

"ارے نہیں بھوندو۔۔۔! ابھی اس کی بیٹری چارج نہیں ہوئی۔

"تھنوں میں دودھ نہیں اترا"

"اسے آج ہی ذبح کر دو خواجہ"

راجگورو نے دیگچی میں ڈوئی ہلاتے ہوئے کہا۔

"اور یہ ماش کی دال کا تغار تمہارا باپ کھائے گا؟"

اتنے میں بکری کا مالک اس کی تلاش میں ادھر آ نکلا۔ گامی نے جلدی سے اندر جا کر بکری کا منہ رانوں میں لے کر دبوچ لیا۔ تاکہ وہ کہیں آواز دیکر سارا بھانڈا نہ پھوڑ دے۔ باہر خواجہ بینڈک نے تربوز ایسا سر ہلا کر کہا۔

"بھائی ہم نے تو یہاں کوئی بکری نہیں دیکھی"۔

اور پھر بڑی بے نیازی سے راجگورو سے مخاطب ہو کر بولا۔

"راجگورو جی! جلدی جلدی پکاؤ بڑی بھوک لگی ہے"۔

بکری کا مالک نا امید ہو کر واپس چلا گیا۔ ساری رات بکری ہماری کوٹھڑی میں بند رہی

اور ساری رات یہ بحث ہوتی رہی کہ ذبح کیا جائے یا اس کے مالک کو پہنچا دی جائے نمازی شیر گل کا خیال تھا کہ بکری کو آزاد کر دیا جائے۔

"کیوں ماماں! ہم نے اسے غلام بنا کر رکھا ہے کیا؟ اور پھر بکری کا مالک تیرا چاچا لگتا ہے؟"

خواجہ بینڈک نے پوچھا۔

شیر گل نے کہا۔

"ایسا کرنا گناہ ہے خواجہ۔"

"اور لونڈوں سے بغل گرم کرنا ثواب ہے؟"

"لعنت ہے تجھ پر حرامزادے------------"

مدقوق ڈرائیور امام دین کے خیال میں بکری کو دھپ سرٹی کے ٹھیکیدار کے حوالے کر دینا چاہیے۔ گامی باکسر نے پوچھا۔

"وہ کیوں جی؟ ٹھیکیدار کیا اسے بغدادی قاعدہ پڑھائے گا؟"

مدقوق امام دین نے کہا

"گامی تم پوری بات سن لیا کرو"۔

"چلو بولو بولو شاہ بہرام۔"

میرا مطلب تھا کہ وہاں ہم اسے پالیں گے اور جب اس کے تھنوں میں دودھ آ جائے گا تو اس کا دودھ پیا کریں گے"۔

"فٹ شیخ چلی دیا پترا، کیسی بات کی ہے تو نے---وہاں اس کے تھنوں میں دودھ کیسے آئے گا؟"

گامی باکسر نے ناک پر انگلی رکھ کر کہا۔

"ٹھیکیدار اس کی شادی کروا دے گا"۔

شیر گل نے کہا۔

"راجگورو کی رائے لے لو"۔

خواجہ بینڈک نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

خدا کے لئے اس شخص کی رائے مت لینا۔ یہ تو وہ شخص ہے کہ اگر کہیں جج لگا ہوتا تو

سائیکل کے چالان والوں کو پھانسی پر چڑھوا دیتا؟۔

طے یہ پایا کہ صبح بکری کو ذبح کر دیا جائے۔ اس کا اچھا اچھا گوشت خود رکھ لیا جائے اور باقی جو بچے وہ دوسرے ڈرائیوروں اور غریب غربا میں تقسیم کر دیا جائے۔

راجگورو نے پوچھا۔

"یہاں تو فوراً بھانڈا پھوٹ جائے گا"۔

گامی باکسر بولا۔

"چاچا جی ہم بھانڈا لے کو دوسرے ڈیرے پر چلے جائیں گے"۔

خواجہ بینڈک نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"ہاں ہاں ہم وہاں جا کر اسے ذبح کریں گے۔ ویسے یہ کوٹھڑی ایسی ہے کہ اگر یہاں آدمی کو بھی قتل کر دیا جائے تو کسی کو حشر تک خبر نہیں ہو سکتی"۔

راجگورو نے پوچھا۔

"سردار خاں کو کیا کہو گے؟"

"کہہ دوں گا کہ میں نے قربانی دی ہے"۔ خواجہ بینڈک بولا۔

بد نصیب بکری دوسرے روز اسی کوٹھڑی میں ذبح کر دی گئی۔

خواجہ بینڈک نے اس کی گردن پر چھری چلائی اور گامی باکسر باہر پہرہ دیتا رہا۔ مچھلی اور رانوں کا گوشت تو خود رکھ لیا گیا اور باقی ڈرائیوروں وغیرہ میں بانٹ دیا گیا۔ گامی ایک تھال گوشت سے بھر کر مسجد کے مولوی کو بھی دے آیا۔

"مولوی جی ہم نے قربانی دی ہے ختم پڑھ دیں"۔

مولوی جی نے بسم اللہ پڑھ کر تھال سنبھالا اور حجرے میں لے گئے۔

راجگورو اور شیر گل اگرچہ اس ناجائز ذبیحہ کے سخت خلاف تھے۔ لیکن اس روز انہوں نے بھی چوری کی بکری کے سالن میں نان خوب ڈبو ڈبو کر کھائے اور چٹخارے بھرتے رہے۔

شیر گل نے پیٹ بھر کر کھانے کے بعد ڈکار لے کر کہا۔

"سبحان اللہ: خدا سب کو رزق دے دیتا ہے"۔

گامی باکسر پایہ چباتے ہوئے بولا۔

"خدا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ پتھر میں بھی کیڑے کو روزی دے گا"۔

رات کو سردار خاں نے ڈیرے میں آکر پوچھا۔

"کیوں بھئی خواجہ یہ قربانی تجھے یہاں آکر یاد آئی؟ امرت سر میں تم بھول گئے تھے؟"

خواجہ آنکھیں بند کر کے بولا۔

"خاں جی! خدا نے مجھے یہیں آکر یہ توفیق دی"۔

شیر گل نے تسبیح پھیرتے ہوئے کہا۔

"خدا سب کو توفیق دے"۔

دسمبر کے آخر میں بارشیں شروع ہو گئیں۔

کچھ روز تھوڑے تھوڑے دنوں کے وقفے کے بعد بارش ہوتی رہی۔ سردیوں کی بارش نے سرگودھے کی سردی میں اضافہ کر دیا۔ اور رات کو غضب کا پالا پڑنے لگا۔ کمپنی باغ میں درختوں نے پتے جھاڑنے شروع کر دیے۔ سول لائنز کی کشادہ اور پکی سڑکوں کی دونوں جانب کھڑے ٹاہلی کے قد آور گنجان درختوں کے پتے گہرے براؤن رنگ کے ہو کر سڑک پر گرتے اور پھر پوہ ماگھ کی زمستانی ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اڑتے رہتے۔ دوپہر کو جب کبھی بادل چھائے ہوتے اور بارش کے ایک ہلکے سے چھینٹے کے بعد ہوا چل نکلتی تو میں یونہی آوارہ گردی کرنے ان سڑکوں پر آجاتا۔ کچے راستوں کی گرد اور مٹی بارش کی وجہ سے بیٹھ گئی ہوتی۔ پرانی طرز کی کوٹھیوں کے لان ویران ہوتے اور لوگ سخت سردی میں بند کمروں میں انگیٹھیوں کے آگے بیٹھے ہوتے۔ جہاں کوٹھیاں ختم ہوتیں وہاں سے کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ ان کھیتوں میں پالک اور گاجروں کے ہرے ہرے پتے ہوا کے جھونکوں میں ہل رہے ہوتے۔ کہیں پیاز اور مولیاں بوئی ہوتیں۔ بچپن ہی سے کھیتوں میں گھومنے پھرنے کی وجہ سے میں کھیت سے باہر نکلا ہوا پتا دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ یہ پالک ہے اور یہ مولی اور یہ گاجر ہے۔ گاجر کے پتے کہیں کہیں سرخ ہوتے اور وہ بے حد پیارے لگتے۔

اسی طرح میں کبھی شہر کے گلی کوچوں کی طرف نکل جاتا۔ آوارہ گردی سے مجھے حقیقی اور روحانی خوشی ملتا تھی۔ جب مجھے یہ احساس ہوتا کہ میں بے مقصد ان گلی کوچوں اور کھیت پھلواڑی میں گھوم پھر رہا ہوں تو مجھے یوں لگتا جیسے میں قدرت کا بہت بڑا مقصد پورا کر رہا ہوں۔ جب میں رجسٹر ہاتھ میں لے کر اندراج کر رہا ہوتا اور دیکھتا کہ باہر کھیتوں اور درختوں

میں سردیوں کی بارش ہو رہی ہے۔ تو میرا دل بے حد اداس ہو جاتا۔ مجھے شرم محسوس ہوتی۔ اپنے آپ پر ایک قیدی کا گمان ہوتا جیسے اس کے بھائی بند سلاخوں والی کھڑکی کے باہر کھڑے ہاتھ ہلا ہلا کر بلا رہے ہوں یا اس کے مذموم جرم پر اس نفریں کر رہے ہوں۔ دل کہتا کہ رجسٹر بند کر کے قلم میز پر رکھ کر کوٹ پہن کر اٹھو اور ان درختوں، کھیتوں اور باغوں میں جا کر بارش کے قطروں اور لہراتی ڈالیوں کے ساتھ مل کر ان ازلی ابدی اور کبھی نہ ختم ہونے والی مسرت میں شریک ہو جاؤ۔ تمہیں اس کیا غرض کہ پی۔ بی ایل 2638 نے کتنا پٹرول ڈلوایا ہے اور پر سکون گھروں پر بمباری کروانے والے زیر تعمیر ہوائی اڈے پر روڑی کے کتنے ٹرک بھیجے جا چکے ہیں۔ وہ دیکھو کھیت کی کچی منڈیر کے پاس ہی سفید گلاب کا ایک پودا لگا ہے ایک پورا کھلا ہوا سفید گلاب اس کی ٹہنی پر چپ چاپ اور خاموش ہے۔ اس کے پاس کوئی رجسٹر نہیں، کوئی سڑک نہیں، کوئی کارخانہ نہیں، کوئی ہوائی اڈا نہیں۔ اس نے کوئی داشتہ نہیں رکھی ہوئی۔ وہ کسی بیوی کی یاد میں آہیں نہیں بھرتا۔ وہ کسی رنڈی کو محبت بھرے خط نہیں لکھواتا وہ کبھی کسی سے گلہ نہیں کرتا۔ وہ کبھی کسی کو اپنی محبت کا یقین نہیں دلاتا۔ اس نے کبھی کسی بیوی کو طلاق دے کر گھر سے نہیں نکالا۔ اس نے کبھی کسی لڑکی کو یہ نہیں کہا کہ میرا کوئی بچہ نہیں۔ میں نے کبھی شادی نہیں کی اور میں ابھی تک کنوارا ہوں۔ اس نے دنیا کے رتبوں اور اعلیٰ منصوبوں کی خاطر کبھی کوئی جشن نہیں کیا۔ کبھی جھوٹی گواہی نہیں دی، کبھی گھنٹوں پائی پائی کا حساب جوڑنے میں مغز نہیں کھپایا۔ اس نے کبھی کوئی مکان الاٹ کروانے، کسی کلیم کے منظور کروانے کے جھنجھٹوں میں پھنس کر اپنے بال سفید نہیں کیے، چہرے کو بدصورت اور مکروہ نہیں بنایا۔ وہ گلاب کا سفید پھول ہے۔ جدائی، اوصال، آہنگ اور یگانگت کی حسین ترین علامت ہے۔ وہ خوش ہے۔ نہیں وہ خوش بھی نہیں۔ کیونکہ خوشی کو ہمیشہ آنے والے غم کا دھڑکا لگا رہتا ہے، وہ اداس ہے کیونکہ اداسی خوشی کی ماں ہے۔ وہ مسرت کو جنم دیتی ہے اور ماں اپنے بچے کو جنم دے سکتی ہے۔ خوشی اداسی کے پاؤں کے ساتھ ساتھ اڑنے والی گرد ہے۔ اس کے منہ سے گرا ہوا نوالہ ہے۔ اس کی پیشانی سے ٹپکنے والا پسینہ ہے اداسی عظیم ہے۔ غم غیر قدرتی اور غیر فطری ہے۔ پریشانی اور اضطراب عذاب ہے۔ ملال اذیت ہے اور روحانی کوفت ہے۔ اداسی کے بعد ہمیشہ تسکین ہوتی ہے۔ خوشی ہوتی ہے۔ مگر پریشانی کے بعد ہمیشہ پریشانی ہی ہوتی ہے۔ پریشان آدمی غیر پریشان لمحات

میں بھی آنے والی پریشانیوں کے ڈر سے پریشان رہتا ہے۔ خوشی دراصل اس سرحد کا نام ہے جہاں مسرت کا علاقہ ختم ہوتا ہے اور اداسیوں کی مملکت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دنیا میں بہت کم لوگ اداس ہوتے ہیں اور بہت زیادہ پریشان اور غم گین ہیں۔ اداسی کی کیفیت، محبت، علم اور ذوق کا معراج ہے، لیکن غم اور دکھ اقتصادی ناہمواری۔ معاشرتی زبوں حالی اور جسمانی ناآسودگی کا نتیجہ ہوتے ہیں ان تمام دردانگیز نتائج کو معاشرے کا غلط نظام جنم دیتا ہے اور اس نظام کی ذمہ داری ان افراد پر ہوتی ہے جو ان کو چلارہے ہوتے ہیں اور یوں ان لوگوں پر بھی عائد ہوتی ہے جو ان لوگوں کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ ایسا نظام چلائیں۔ اس میں نہ قسمت کو دخل ہے نہ خدا کو۔۔۔۔ قسمت اتنی گھٹیا شے ہے کہ وہ انسان ایسی عظیم ہستی کو اپنے دائرہ اختیار میں لینے کی اہل نہیں اور خدا اتنا عظیم ہے کہ وہ انسانوں کے چھوٹے چھوٹے مسائل میں کبھی دخل نہیں دیتا۔ نیچر ایک اندھی قوت ہے خدا ایک عقلِ کل ہے اور انسان ان دونوں اجزا کا مجموعہ ہے۔ انسان کو گلاب کے سفید پھول سے آگے بڑھنا ہے۔ لیکن وہ اس کی مرجھائی ہوئی پتیوں سے بھی زیادہ فرسودہ زیادہ بوسیدہ اور زیادہ غیر رومانٹک ہے، وہ اس کیچڑ کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا جو کنول کے شگوفے کو پیدا کرتا ہے، وہ ہوائی جہاز بنا سکتا ہے۔ لیکن شہتوت کی ٹہنی پر اپنی طرف سے ایک سرخ شہتوت نہیں لگا سکتا۔ ٹھیک ہے وہ ہائیڈروجن بم بنا کر ساری دنیا کے انسانوں کو ہلاک کرسکتا ہے۔ مگر اس کی ساری مشینیں، سارے ماڈرن سائنسی آلات مور کا ایک پنکھ بھی نہیں بنا سکتے۔ وہ چند گز زمین کی خاطر اپنے بھائی کو ہلاک کرسکتا ہے لیکن نہر کنارے بارش میں بھیگتے پھول کو دیکھ کر کبھی اس کا منہ نہیں چوم سکتا۔ وہ ایک بے یارومددگار عورت کو اغوا کر کے اس سے زنا بالجبر کرسکتا ہے اس بازار میں فروخت کرسکتا ہے لیکن دوسرے کی بہن کو گلی میں سے گزرتا دیکھ کر احترام سے آنکھیں نیچی نہیں کرسکتا۔ پھر یہ لوگ کیسے توقع رکھتے ہیں کہ ان کی بہن کو بھی بری نگاہ سے نہیں دیکھے گا؟ یہ انیائے ہے۔ انہونی کی امید ہے۔ ریت کے غبار سے بارش کی توقع ہے۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوا اور ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ اس کائنات کا نظام ایک اٹل قانون کے تحت چل رہا ہے۔ اس قانون کو اسی قانون کی حرکت نے جنم دیا ہے۔ اور اس نظام کے پرزے کی حرکت اپنی حرکت کے قانون پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے۔ جن لوگوں نے معجزے دکھائے تھے انہوں نے بھی قدرت کے اس ناقابل شکست قانون کی

اطاعت کی تھی ان کا ہاتھ قدرت کے ہاتھ میں تھا۔ ان کی آنکھیں اس ابدی قانون کو ارتقائی مراحل طے کرتے عریاں دیکھ رہی تھی۔ ان کی عظمت اس بات میں نہیں تھی کہ انہوں نے پہاڑ کے ٹکرے ٹکرے اڑا دیئے تھے۔ بلکہ اس میں تھی کہ انہوں نے معلوم کر لیا تھا کہ قدرت کب اس پہاڑ کے ٹکرے اڑا رہی ہے۔ اور پھر جب انہوں نے انگلی اٹھائی تو اس دعوے میں نہیں کہ میں پہاڑ کو شق کر سکتا ہوں بلکہ اس اعتراف میں کہ دنیا کی کوئی طاقت اب اس پہاڑ کو دو ٹکرے ہونے سے نہیں بچا سکتی۔ انسان کی بڑی سے بڑی آہ وزاری بھی قدرت کے اس قانون کو بدلنے سے اور پہاڑ کو پاش پاش ہونے سے نہیں بچا سکتی۔ کیونکہ یہ مارگ ہے۔ یہ ضابطہ ہے۔ یہ نیائے ہے۔ یہ سلامتی ہے۔ یہ وہ قانون ہے جس کو صرف اسی قانون سے عاجز کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس دوست کا آئینہ ہے جو صرف اسی دوست کے پتھر سے ٹوٹ سکتا ہے۔ یہی انصاف ہے یہی تقدیر ہے اور قدرت اپنے ترازو کے دونوں پلڑے ہمیشہ برابر رکھتی ہے۔

دنیا میں بھی میزان۔ قیامت میں بھی میزان

صبح کی سیر سے واپسی پر میں ایک مکان کے قریب سے گزرا کرتا تھا۔ یہ مکان ریلوے لائن کی پرلی جانب ان کھیتوں کے پاس مڑ کر اس پگڈنڈی پر آتا جو لائن کی طرف چلی گئی تھی تو مجھے اس مکان کے بالکل پاس سے ہو کر گزرنا پڑتا۔ مکان کا دروازہ تو دوسری جانب تھا۔ اس طرف اس کے پہلو والے کمرے کی کھڑکیاں کھلتی تھیں۔ عام طور پر صبح کو یہ کھڑکیاں سردی کی وجہ سے بند ہوتیں کبھی کبھی کونے والی کھڑکی کھلی ہوتی اور میں قریب سے گزرتے ہوئے اندر نگاہ ڈالتا تو ایک لڑکی کو لحاف طے کر کے پلنگ پر رکھتے، جھاڑو دیتے اور کبھی میز کرسیوں کی جھاڑ پونچھ کرتے دیکھتا۔ ایک دو بار اس لڑکی نے مجھے بھی دیکھا۔ ایسے ہی جیسے راستے میں کوئی سامنے آ جائے اور اسے ایک نظر دیکھ لیا جائے اور بس۔ لیکن میں اپنی عادت سے مجبور ہو کر پہلی ہی نظر میں اس پر عاشق ہو گیا۔ جس روز کھڑکی کھلی ہوتی۔ میں بڑے اشتیاق سے اندر جھانکتا۔ اس کا رنگ سانولا تھا اور وہ درمیانے قد کی صحت مند لڑکی تھی۔ چوڑے نتھنوں والی ناک کے ساتھ ساتھ پختگی کی علامات نمایاں تھیں۔ چہرے پر سنجیدگی اور متانت تھی۔ مجھ سے کبھی آنکھیں چار ہوتیں تو ذرا بھی نہ گھبراتی۔ بڑے ٹھنڈے دل سے ایک پل کے لئے دیکھتی اور بغیر شرمائے یا مسکرائے نظریں پھیر کر اپنے کام میں پھر سے مگن ہو جاتی۔

درمیانے قد۔ ذرا بھاری جسم اور چوڑے نتھنوں والی لڑکیاں میری بڑی کمزوری رہی ہیں۔ ایسی لڑکیوں کے لئے میں باڈر بھی کراس کر سکتا ہوں چاہے گولیاں چاروں طرف برستی رہیں۔ چنانچہ میں نے ایک رات کو اپنی چارپائی پر گوتم بدھ کی طرح بیٹھ کر اس لڑکی کو ایک پریم بھرا خط لکھا۔ بڑی محبت سے اس "پیاری سجنی" لکھا ہر محبت کی قسمیں کھائیں۔ خدا کی قسمیں کھائیں کہ میں اسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ یہ خط میں نے ایک دن صبح کو سیر سے واپسی پر جبکہ اس کی کھڑکی کھلی تھی۔ اور وہ اندر بستر کی چادر ٹھیک کر رہی تھی۔ اس کے پاس پھینک دیا۔ سارا دن اور ساری رات اپنے دل کو تسلیاں دیتا رہا کہ وہ خط کو بار بار پڑھ رہی ہو گی۔ پڑھ پڑھ کر سینے سے لگا رہی ہوگی۔ اور اب خط کا جواب لکھ رہی ہوگی۔ اسے خوشبوئیں بسا رہی ہوگی۔ اس کے اندر اپنی محبت کی نشانی ایک ریشمی رومال تہہ کر کے رکھ رہی ہوگی۔

دوسرے روز میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کھڑکی کے پاس پہنچا تو میں نے اس لڑکی کو اپنا منتظر پایا۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے فیروزی رنگ کی گرم شال اوڑھ رکھی تھی۔ اس نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔ میں اس کے پاس آگیا۔ خدا نے میری سن لی تھی۔ حسن خود عشق کو اپنی طرف بلا رہا تھا۔ چاند خود چکور کے پاس بھاگا آرہا تھا۔ میں فرطِ مسرت سے جھومتا لہراتا خوشی سے ناچتے دل پر ہاتھ رکھے کھڑکی کے پاس آگیا۔ اس لڑکی نے میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ مجھے ساری دنیا ناچتی معلوم ہوئی۔ مجھے یقین تھا کہ ابھی وہ ہاتھ بڑھا کر مجھے اپنے سینے سے لگا لے گی۔ اچانک اس نے شال کے اندر سے ہاتھ باہر نکالا اور اس زور سے سینڈل میرے سر پر ماری کہ مجھے دن کو تارے نظر آگئے۔ میں لائن کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ اور اس کی گالیاں میرا تعاقب کرتی رہیں۔ آہاہا۔ کیا مزیدار عشق ہے۔ کیا پریم بھرا خط لکھا ہے اس لڑکی نے! ۔ ریلوے لائن کے پار جا کر میں نے سر پر ہاتھ پھیر کر دیکھا کہ کہیں محبت کی چوٹ کھا کر خون تو نہیں نکل آیا۔ دل خون ہو گیا تھا۔ مگر سر سلامت تھا۔ چلو سر سلامت رہے تو اور بھی عشق کر لیں گے۔ کتنی بد ذوق لڑکی تھی۔ محبت کا جواب جوتا -------- سبحان اللہ! اس لڑکی کا بھی جواب نہ تھا۔ میں نے سوچا کہ اصل میں غلطی مجھ سے ہو گئی۔ لڑکیاں محبت کی باتوں سے نہیں بلکہ نئے نئے تحفوں سے خوش ہوتی ہیں۔ مجھے چاہیے تھا کہ میں اسے انگوٹھی یا نئے سینڈل کا کوئی تحفہ دیتا۔ میں نے بڑی غلطی کی جو چھوٹتے ہی پریم پتر کی تو ان دنوں قدر تھی جب یہ بھوج پتروں پر لکھے جاتے تھے۔ آجکل تو محبت

کے خط میکس فیکٹر کے ڈبوں پر لکھ کر بھیجے جاتے ہیں ------------------ لیکن میرے پاس تو سوائے موبل آئیل کے خالی ڈبوں کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ بڑی بد تمیز لڑکی تھی۔ اسے کسی نے شریف آدمیوں سے بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں سکھایا؟ ایسی لڑکی کا میرے ساتھ گزارہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ میں نے اس طرف صبح کی سیر چھوڑ دی۔

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

5

ایک روز شام کو میں ڈیرے پر آیا تو وہاں عجیب نقشہ دیکھا۔

ڈیرے کے سارے ڈرائیور چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ ایک طرف سردار خاں کرسی پر بیٹھا تھا۔ اور ان کے درمیان دو کلینروں نے مرغ بن کر کان پکڑ رکھے تھے۔ سردار خاں نے ایک کلینر کا پاجامہ اتروا کر اس کی ٹانگوں میں رسی باندھ کر اس کا سرا اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ وہ ذرا سی کھینچتا تو کلینر چیخ مارتا۔

"حرامزادے اب کرے گا بدفعلی؟"

"خاں جی معاف کر دو۔ اب کبھی نہیں کروں گا۔ خدا کی قسم اب کبھی نہیں کروں گا"۔

"بیٹا ابھی تیری طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی۔ غضب خدا کا تم لوگ مجھے بدنام کرنے لگے۔ ٹانگ بھر کے چھوکرے اور یہ بدمعاشیاں!"

باقی ڈرائیور خوش ہو کر تالیں بجا رہے تھے۔ اور دونوں کلینروں کو فحش گالیاں بک رہے تھے۔ معلوم ہوا وہ دونوں کلینر غیر فطری فعل کرتے پکڑے گئے تھے۔ سردار خاں نے گامی باکسر سے کہا۔

"لاؤ گامی ادھر سے دو اینٹیں ذرا۔ ان حرامزادوں کو میں آج پورا مزا چکھا کر چھوڑوں گا"۔

جب ان کلینروں کی جھکی ہوئی پیٹھوں پر اینٹیں لادی گئیں تو انہوں نے درد سے کراہنا شروع کر دیا۔ جب درد اور تکلیف سے ان کا برا حال ہو گیا اور وہ زمین پر گر پڑے تو سردار خاں نے انہیں دو تین تھپڑ مار کر وہاں سے بھگا دیا۔ اس کے بعد وہاں کوئی گھنٹہ بھر خلاف فطری فعل پر بڑی دلچسپی سے باتیں ہوتی رہیں۔ سب ڈرائیوروں نے اس بحث میں بڑی گرمجوشی سے حصہ لیا۔ شیر گل سب سے پیش پیش تھا۔ اس نے کہا۔

"اگر مقصد یہ ہو کہ حسن پرستی کی جائے تو کوئی گناہ نہیں"۔

گامی بولا۔

"تم تو جیسے حسن پرستی ہی کرتے ہو"۔

"چاہے مجھ سے جیسی قسم لے لو"۔

"قسم تو تم ہمیشہ جھوٹی کھاتے ہو"۔

"جھوٹے پر خدا کی لعنت"۔

سردار خاں نے کہا۔

"نہیں جی یہ کام برا ہے اور اسے جو بھی کرتا ہے وہ دنیا کا انتہائی غلیظ اور برا آدمی ہے"۔

خواجہ پسند نمک چٹخارہ بھر کر بولا۔

"آخر خدا نے عورت کس لئے بنائی ہے"۔

راجگورو نے کہا۔

"بھنگ گھوٹنے کے لئے"۔

گامی بولا۔

"میں یہ پوچھتا ہوں خاں جی کہ یہ جو گل چپکے سے لونڈے کو لے کر کوٹھے کی چھت پر چڑھ جاتا ہے تو کیا اسے کوئی رسی باندھنے والا نہیں؟"

خواجہ نے جواب دیا۔

"بھئی یہ تو حسن پرستی کرتا ہے۔"

کیا حسن پرستی صرف کوٹھے پر ہی ہوتی ہے؟"

"بالکل۔"

شیر گل نے تڑپ کر کہا۔

"حرامزادے تو کیا جانے کہ عشق کیا بلا ہوتی ہے۔ تو اپنا شراب کا گھونٹ پی اور رنڈیوں کے پاس جا۔ تجھے ان باتوں سے کیا؟"

"ٹھیک ہے لیکن ہم ایسا ہی کرتے ہیں جیسا کہ مرد کو کرنا چاہیے تم تو مردوں والی باتیں کرتے ہو۔ ارے یہ کام تو کتے بھی نہیں کرتے"۔

شیر گل نے غصے میں کہا۔

"گامی زبان سنبھال کر بات کرنا۔"

سردار خاں

''شیر گل تم کیوں گرم ہوتے ہو۔ تم تو یہ کام کرتے ہی نہیں۔ پھر لال پیلے ہونے سے کیا مطلب؟''

''خاں جی آپ دیکھتے ہیں کہ یہ مجھ پر الزام لگا رہا ہے''۔

گامی نے کاغذ ہلا کر کہا۔

''تم جتنے حاجی ہو۔ وہ سب لوگ یہاں جانتے ہیں''۔

''جو کچھ بھی ہوں تمہیں کچھ نہیں کھاناں''۔

''مجھے کہ کر کسی نے اپنی گردن تڑوانی ہے؟''

''بکواس بند کرو''۔

''تیری ماں --------''

اگر سردار خاں وہاں نہ ہوتا تو ضرور ایک آدھ کا خون ہو جاتا۔

شیر گل آگ بگولہ ہو کر اٹھا اور بولا۔

''میں کافر ہوں گا اگر ایک پل بھی اس کوٹھڑی میں رہوں گا''۔

سردار خاں نے کہا۔

''گل خواہ مخواہ گرم نہیں ہوا کرتے۔ وہ تم سے مذاق کر رہا تھا''۔

''کون بہن یا و امذاق کر رہا ہے''۔

سردار خاں نے اسے جھڑک کر دیا۔

''بک بک بند کراوئے تو''۔

اس ساری بک بک کا نتیجہ یہ نکلا کہ رات ہونے سے پہلے پہلے شیر گل نے وہاں سے اپنا بوریا بستر لپیٹ کر مزدور کو اٹھوایا اور دوسرے ڈیرے پر جا کر پڑ گیا۔ ادھر سے یوسی پھینا اپنا بستر لیکر ہمارے ڈیرے میں آ گیا۔

یوسی پھینے کے ساتھ اس کا کلینر کوبی لفنتہ بھی آ گیا۔ ادھر سے شیر گل کے ساتھ اس کا ڈرائیور سیلا جھلا بھی چلا گیا۔ یوسی پھینے کے ہمارے ڈیرے میں آ جانے سے یہاں ہر روز شراب پی کر دھما چوکڑی مچنے لگی۔ گامی باکسر اس کے ساتھ مل کر روز شراب پیتا اور جب یوسی پھینا دھت ہو کر اپنے سسر اور بیوی کو گالیاں دیتا تو گامی باکسر بھی اس کے ساتھ مل کر

ان لوگوں کو گالیاں دینی شروع کر دیتا۔ ایک روز صبح اٹھ کر سر پر ہاتھ پھیر کر کچھ سوچتے ہوئے یوسی پھینے نے گامی باکسر سے پوچھا۔

"کمینے! تو رات کو میرے سسر کو گالیاں دے رہا تھا؟"

"تمہیں کس نے کہا؟"

"میرا دماغ کہتا ہے کہ تم رات کو گالیاں دے رہے تھے"۔

"تمہارے دماغ میں تو بھوسہ بھرا ہے تم نے خواب دیکھا ہو گا"۔

"تو پھر تم نے گالی نہیں دی ناں۔

"بالکل نہیں پیارے"۔

یوسی پھینے کو یقین آ گیا اور وہ مطمئن ہو گیا۔ گامی باکسر نے صرف اس لئے مکر کیا تھا کہ اس طرح وہ یوسی کی شراب ہضم نہیں کر سکتا تھا۔

گامی باکسر کو یوسی پھینے کی شراب مل گئی تھی اور کوبی لفتے کے ہاتھ میں لگ گیا تھا۔

گامی باکسر نے یوسی کی شراب پی پی کر اس کا دیوالہ نکال دیا۔ اور کوبی نے اپنی فیروز پور کی ممتاز کے نام مجھ سے خط لکھوا لکھوا کر میرا کچومر نکال دیا۔ وہ ان پڑھ تھا اور الف کا نام نہیں جانتا تھا۔ میں نے بھی اس سے بدلا لینا شروع کر دیا۔

جب وہ لفافہ اور کاغذ لے کر میرے پاس آتا اور کہتا۔

"بٹ جی آج بس ایسا مسالے دار خط لکھیے کہ سالی اوئی اوئی کرتی فیروز پور سے سرگودھے میرے پاس آ جائے"۔

میں اسی وقت سوچنا شروع کر دیتا کہ آج کس کو خط لکھنا چاہیے؟

وہ کہتا۔

"اسے لکھیے ------ میری موٹر کی بیٹری! میری جان ممتاز جی -----"

تو میں خط پر لکھتا۔

"محترمی والد صاحب! السلام علیکم --------- یہاں خیریت ہے اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں۔

بات یہ ہے کہ ---------"

کوبی پوچھتا۔

"کیا لکھا ہے بٹ جی؟"

میں اسے پڑھ کر سناتا۔ پڑھتا کچھ اور سناتا کچھ اور۔

"لکھا ہے۔ ممتاز جی ---------- سلام محبت - میری جان تم نے اپنے عاشق ناشاد کو بھلا دیا؟ ہم تو تیرے فراق میں روتے رہتے ہیں ------------"

"بہت خوب -- اب لکھئے --- ممتاز جی! تمہارا مجرا دیکھے ایک زمانہ ہو گیا - دل میں تمہاری یاد چٹکیاں کیوں بٹ جی چٹکیاں لینا ہوتا ہے کہ چٹکیاں بجانا؟"

میں نے کہا

"چٹکیاں بجانا"۔

"ٹھیک ہے -------- تو اسے لکھئے کہ دل میں تمہاری یاد چٹکیاں بجاتی ہے - دماغ میں کوئی سارا دن کلہاڑے مارتا رہتا ہے۔ دل کہتا ہے۔ اٹھ کر لکڑ کا مڈھ پھاڑ دو---------"

میں ادھر لکھتا۔

"جناب والد صاحب! آپ سے ملے ایک عرصہ ہو گیا دل آپ سب لوگوں کے لئے اداس ہے۔ میرا خیال ہے میں اس اتوار کو دو ایک دنوں کے لئے امرتسر آ جاؤں۔ نصیر دین درزی سے میرا پرانا کوٹ لے لیں۔ اس نے مرمت کر دیا ہو گا ----------"

کوبی مزے لے لے کر کہہ رہا تھا۔

"اور لکھئے کہ تیرے بغیر راتوں کو نیند نہیں آتی"۔

اور میں لکھتا۔

"بھیکو موچی نے میرے جوتے کا ناپ لیا تھا اس کا کیا بنا؟"

ایک روز میں ہوائی اڈے پر بجری والے ٹرک میں گامی باکسر کے ساتھ بیٹھ کر اور سیَر سے پھیروں کے اندراج کی تصیح کے لئے گیا تو وہاں وہی کالی آنکھوں والی اور کالے پیٹ والی مزدور لڑکی اور سیَر کا پانی سے ہاتھ دھلا رہی تھی۔ خواجہ ہینڈک ذرا پرے اپنی لاری کے بونٹ سے ٹیک لگا کر کھڑا سگریٹ پی رہا تھا اور اور سیَر کو قہر آلود نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ گامی بھی لاری ایک طرف کر کے خواجہ کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اور ٹانگیں پھیلا کر بولا۔

"اس باؤ کی ماں کو بنبر لے جائیں یہ اس سالی کو نہیں چھوڑے گا۔"

محمد طارق اقبال

خواجہ ہینڈک نفرت سے بولا۔

"دیکھو گیدڑ کی اولاد۔ یوں ہاتھ دھلوا رہا ہے جیسے وہ اس کی بھتیجی لگتی ہے"۔

راج گورو بھی وہاں آگیا۔ آتے ہی وہ بھی اس منظر کی اذیت بخش دلچسپی میں شریک ہو گیا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"پیارے خواجہ میں نہ کہتا تھا کہ یہ باؤ میدان مارے گا"۔

خواجہ بولا۔

"اس کی اتنی اتھارٹی نہیں کہ یہ خواجے کا مال ہضم کر جائے"۔

راج گورو نے سگرٹ جھاڑ کر کہا۔

"خواجہ! یہ لڑکی سانسیوں کی ہے اور سانسی مرا ہوا بلا بھی کھا جاتے ہیں۔ تو نے اس سے جب بھی بات کی بس اسی روز یہ تیری ڈھبری کھول کر رکھ دے گی"۔

راج گورو جی ہم نے بھی بڑے بڑے پرانے ٹرک چلائے ہیں۔ اور یہ تو بری بے بی آسٹن ہے، یہ تو سیلف پر ہاتھ لگنے سے ہی سٹارٹ ہو جائے گی"۔

گامی باکسر کھچڑی ایسے بالوں کو کھجلا کر بولا۔

"مگر خواجہ کہتے ہیں سانسیوں کی لونڈیاں شاٹ بڑا مارتی ہیں"۔

خواجہ ہینڈک نے اسے دھتکار دیکر کہا۔

"بیٹھی رہو نی بائی تیرہ 2213 ایل۔ بی۔ پی"۔

"چپ نی کتیے"۔

"ہٹ کے بدھو"۔

واپسی پر راج گرد کی گاڑی میں بیٹھ کر آیا۔ کیوں کہ اسی کی لاری سب سے پہلے خالی ہوئی تھی۔ سارا راستہ راجگورو مجھے سمجھاتا رہا کہ آدمی کو عورت سے ہمیشہ محتاط رہنا چاہیے۔ اگر اس کا ہاتھ اٹھ جائے تو سر پر ایک بال بھی نہیں رہتا۔ میں اپنی کھڑکی والی محبوبہ کو یاد کرنے لگا۔ جس نے سینڈل مار کر مجھے دن کو تارے دکھا دیئے تھے۔ پھر راج گورو نے اخلاقیات پر لیکچر دینا شروع کر دیا۔

"آدمی کو شریف بن کر رہنا چاہیے۔ کسی کا دل نہیں دکھانا چاہیئے اور نہ کسی عورت کو بری نظر سے دیکھنا چاہیے۔ جب خدا نے ایک عورت حلال کر دی تو باقی ساری عورتیں حرام

ہو جاتی ہیں۔

میں نے کہا۔

"تو کیا آدمی ساری عمر اسی ایک عورت کو حلال کرتا رہے؟"

راجگورو نے سڑک پر نظریں جمائے کہا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے ادھر ادھر منہ مار لینا چاہیے۔ مگر پھر شرافت سے رہنے میں ہی بھلائی ہے"۔

راج گرو گاڑی کو چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلا رہا تھا۔ کیونکہ سڑک بالکل خالی تھی۔ ساری گاڑی کھڑکھڑا رہی تھی اور تیز ہوا کے تھپیڑے پڑ رہے تھے۔ اچانک سڑک کے کنارے ایک اونٹ نظر آیا۔ اس اونٹ پر لکڑیوں کے گٹھے لدے ہوئے تھے۔ ان لکڑیوں کا مالک کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ راج گورو نے منہ پیچھے کر کے چھوٹی سی کھڑکی میں سے کلینر کو کہا۔

"خبر دار ہو جا بھئی"۔

اور اس کے ساتھ ہی اونٹ کے پاس لے جا کر گاڑی کھڑی کر دی۔

"کیا بات ہے۔" میں نے پوچھا؟

"کچھ نہیں" راج گورو نے بڑی بے نیازی سے کہا۔ اور کھڑکی کھول کر نیچے سڑک پر اتر گیا۔ پیچھے کلینر بھی وہاں آ گیا۔ ان دونوں نے مل کر اونٹ کے اوپر سے لکڑیوں کے دونوں گھٹے اٹھا کر ٹرک میں پیچھے پھینک دیئے۔ راجگورو چپکے سے چہرے پر وہی مسکراہٹ لئے اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔ ایک ہی پل میں گاڑی سڑک پر دوڑنے لگی اور خالی اونٹ جگالی کرتا ٹرک کے بہت پیچھے رہ گیا۔ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ تم نے کیا کیا؟ یہ تو چوری ہے"۔

راجگورو نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔

"اس کا مالک آ کر دیکھے گا تو کیا کہے گا؟"

راجگورو نے اس کا بھی کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے چہرے پر وہی بے معنی مسکراہٹ تھی اور ناک سردی میں ٹھٹھر رہی تھی اور وہ یوں انہماک سے گاڑی چلا رہا تھا۔ جیسے اس کے

پاس کوئی بھی نہیں بیٹھا ہے۔ یہ لکڑیاں ہمارے ڈیرے میں کوئی ہفتہ بھر جلتی رہیں اور ان کی آگ پر پکا ہوا سالن ایک روز میں نے بھی کھایا۔ بڑا مزیدار تھا۔

سردی اپنے شباب پر تھی۔

دن کو ایک بجے کے بعد میں شام تک فارغ ہوتا تھا۔ یہ وقت میں زیادہ تر اپنے ایک دوست کیول سیٹھی کے پاس بسر کرتا جو کچہری بازار میں منیاری کی دکان کرتا تھا۔ مجھ سے کوئی چار پانچ سال بڑا منحنی سا گورا چٹا ہندو نوجوان تھا۔ جو باپ کی وفات کے بعد ایک دکان چلا رہا تھا۔ اور اپنی ماں اور چار بہنوں کا پیٹ پال رہا تھا۔ میری اس سے پہلی ملاقات ہوٹل میں ہوئی۔ پھر وہ میرا دوست بن گیا اور میں اکثر اس کی دوکان پر جا کر ایک بجے سے شام تک بیٹھا رہتا۔ کیونکہ وہ بڑا شریف اور کم سخن لڑکا تھا۔ بڑی پیاری پیاری اور دھیمی دھیمی باتیں کرتا تھا۔ گاہکوں سے بات کرتے ہوئے اس کے چہرے پر بڑی میٹھی مسکراہٹ آجاتی اور جب سکول کی لڑکیاں کاپی پنسل وغیرہ لینے آتیں تو کیول کی شرم کے مارے آنکھیں نہ اوپر اٹھا کرتیں۔

اس کے مقابلے میں میں بڑا بدمعاش تھا اور ہر گاہک لڑکی کا پوری طرح سر سے پاؤں تک جائزہ لیتا اور احتیاطاً سینڈل کا حجم بھی دیکھ لیا کرتا۔ ان میں ہندو سکھ مسلمان سب ہی لڑکیاں شامل تھیں۔ کیونکہ لڑکی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ وہ جب چاہیے اور جس وقت چاہے کسی بھی مذہب میں شامل ہو سکتی ہے۔ سلائی کی مشین خواہ ہندو درزی کے ہاتھ میں ہو۔ خواہ مسلمان درزی کے پاس ہو وہ مشین ہی رہے گی۔ یہ کاریگر کا مذہب ہے جو دکان کو ہندو کی دکان اور مسلمان کی دکان بناتا ہے۔ مشین کی وجہ سے ایسا کبھی نہیں ہوتا۔

کاش! دنیا میں کوئی مرد نہ ہوتا۔

کیول کی دکان پر ایک ہندو لڑکی اکثر چیزیں خریدنے آیا کرتی تھی۔ وہ سادہ شلوار قمیض میں ہوتی اور ماتھے پر سرخ بندیا کا نشان ہوتا۔ میں نے جب اس لڑکی کو پہلے روز دیکھا تو اسی وقت اس پر عاشق ہو گیا۔ کیونکہ اس کا قد درمیانہ، جسم ذرا بھاری صحت مند۔ چہرہ گول اور نتھنے فراخ تھے۔ جس طرح شیرنی یا شیر کے ہوتے ہیں۔ مجھے نتھنوں میں ہمیشہ ایک قسم کی وحشت اور درندگی دکھائی دی ہے۔ خیر ان باتوں کو چھوڑدیئے۔ یہ مسئلے بڑی نیچی سطح کے ہیں اور ہم بہت بلندی پر اڑ رہے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس لڑکی کا نام شانتا کوہلی ہے۔ اور وہ

ایک مقامی ہومیوپیتھ ڈاکٹر کی بیٹی ہے۔ اور سناتن دھرم ہائی سکول میں نویں جماعت کی طالبہ ہے۔ پتا جی کی دکان شہر کے مشرقی علاقے میں ہے اور مکان دکان کے اوپر ہی ہے۔ خیر مجھے نہ تو اس کے پتا جی سے کوئی سروکار تھا اور نہ مکان سے۔ میں تو شانتا کوہلی پر عاشق تھا اور صرف اس کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کرنا چاہتا تھا، میں نے کیول پر اپنا دل کھول دیا۔ وہ مسکرایا اور کہنے لگا۔

"اس میں برائی کیا ہے۔ پریم ہو گیا ہے تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ پریم کے بنا جیون میں اور ہے کیا؟"

میں نے کہا۔

"لیکن کیول میں اس سے کیسے بات کروں؟"

"گھبراؤ نہیں--- میں تم دونوں کی بات کر دوں گا"۔

کیول بڑا دوست پست لڑکا تھا۔ ایک روز شانتا کوہلی اس کی دکان پر آئی۔ میں نے اپنی آنکھوں کا کیمرہ اس کے جسم پر فٹ کر دیا۔ بڑا ہوس پرست آدمی ہوں ---- لعنت ہے۔ ابھرا ابھرا پکا ہوا سانولا سا بوجھل سا بدن۔ ماتھے پر سرخ بندیا۔ پوری آستین کا آسمانی سویٹر۔ چھینٹ کی انگوری رنگ کی قمیض۔ سفید لٹھے کی شلوار اور سینڈل ------- (سب سے ضروری چیز) سینڈل نہیں بلکہ کالا جوتا۔

بڑی بڑی آنکھیں اور ان پر جھکی ہوئی نسواری پلکیں۔ کوئی نیل پالش کوئی لپ سٹک کوئی سرخی اور بالوں میں کوئی چھلا نہیں۔ درمیان میں سے نکلی ہوئی مانگ اور پیچھے گئی ہوئی اکلوتی چوٹی------- ایورسٹ کی چوٹی۔ شانتا رف کاپی خریدنے آئی تھی۔ کیول اسے مختلف کاپیاں دکھا رہا تھا۔

"نہیں ویر جی! یہ نہیں۔ اس کا تو کاغذ پھٹ جاتا ہے"۔

"یہ دیکھیں یہ کیسے رہے گی؟"

"یہ تو لکیر دار ہے۔ سادہ نہیں آپ کے پاس؟"

"میں اندر جا کر دیکھتا ہوں"۔

کیول نے میری طرف دیکھ کر آنکھ کا اشارہ کیا اور خود کاپی لانے کے بہانے پچھلی کوٹھڑی میں گھس گیا۔ شانتا بڑی متانت سے کھڑی شیشے کے شوکیس پر رکھی ہوئی کاپیوں کو

الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی۔ میرا دل دھڑکنے لگا اور سر کی وہ رگ پھڑکنے لگی جس پر اس کھڑکی والی لڑکی کا سینڈل پڑا تھا۔ میں نے ہمت کر کے کہا۔

''میرے خیال میں یہ زرد کاپی لے جائیں۔ یہ بڑی اچھی رہے گی''۔

شانتا نے میری طرف پلکیں اٹھا کر ایک پل کے لئے دیکھا اور ذرا سا مسکرا کر بولی۔

''نہیں ویر جی اس کا کاغذ تو بالکل ہی خراب ہے۔''

اونہہ ویر جی ---- کم بخت یہ لڑکیاں ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو بھائی کیوں بنا لیتی ہیں۔ بھلا یہ زمانہ مردوں پر اعتبار کرنے کا ہے۔ شانتا نے ویر کہہ کر مجھے سوامی مہاویر بنا دیا تھا۔ لیکن نہیں نہیں۔

ہندی یا سنسکرت یا پراکرت یا بھاشا۔ یا نراشا میں ویر بھائی کو نہیں بلکہ بہادر کو کہتے ہیں اور میں بہادر ہوں شانتا نے مجھے بہادر کہا ہے۔ بھائی نہیں کہا۔ گویا اس کو میری شجاعت کا اعتراف ہے کہ میں نے اس کے ساتھ بات کرنے میں پہل کی ہے۔ جے شانتا کوہلی۔

زندہ باد شانتا کوہلی۔ میرا حوصلہ بڑھ گیا۔

آپ کونسی کلاس میں پڑھتی ہیں؟''

''جی ناویں میں۔''

''سناتن دھرم --------''

''جی ہاں سناتن دھرم ہائی سکول میں۔ مگر آپ کو کیسے معلوم ہے ویر جی؟''

اونہہ! پھر ویر جی ---!

''مجھ کو تو یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کا مکان کہاں ہے اور آپ کے پتا جی کہاں ڈاکٹری کرتے ہیں''۔۔

شانتا کوہلی نے مسکرا کر کہا۔

''ان کی دکان تو ہمارے مکان کے نیچے ہی ہے''۔

''میں نے آپ کو وہاں جاتے اکثر دیکھا ہے''۔

''اچھا شانتا نے میری طرف دیکھے بغیر آہستہ سے کہا۔

میں شانتا کو یہ کہنے ہی والا تھا کہ میں آپ کو کل بھی مکان کے باہر دیکھنے آؤں گا کہ میرا دوست کیول کوٹھڑی سے گرد میں اٹا ہوا باہر نکل آیا۔ اس نے رف کاپیوں کا پورا

پلندہ اٹھا رکھا تھا۔ شانتا اسے دیکھ کر ہنس پڑی۔

''ویر جی! آپ تو اندر سے ساری دکان ہی اٹھا لائے''۔

میں نے کہا۔

''جی کیا کریں وہ بھی ----- آپ ایسے گاہکوں کو خالی ہاتھ بھی تو واپس نہیں بھیج سکتے

شانتا نے میری اس بات کا جواب دیئے بغیر کیول سے مخاطب ہو کر کہا۔

''ویر جی! اس میں سے خود ہی کوئی موٹے کاغذ والی کاپی نکال دیں اور ہاں لکیر دار نہ ہو''۔

جتنی دیر شانتا کوہلی وہاں کھڑی موٹے کاغذ والی کاپی کا انتظار کرتی رہی میں اس کے موٹی آنکھوں والے گول گول سانولے چاند ایسے چہرے کو دیکھتا رہا۔ کسی وقت معلوم ہوتا کہ وہ بڑی بھولی ہے۔ میری طرح -----اور اسے دنیا کی کسی بات کا کوئی علم نہیں اور کسی وقت یوں محسوس ہوتا کہ وہ بڑی ہوشیار لڑکی ہے۔ میری طرح ---اور وہ میری ایک ایک حرکت کا پورا پورا مطلب سمجھ رہی ہے۔ میں تو خود یہی چاہتا تھا کہ کوئی ایسی لڑکی ملے جو خود بخود ہی سارا مطلب سمجھ لے اور مجھے اسے کچھ نہ بتانا پڑے۔ ذرا غور کیجئے کہ میں ایک لڑکی کو طوطے کی طرح سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ لیکن اس کے پلے کچھ نہیں پڑ رہا۔

جب شانتا موٹے کاغذ والی کاپی لے کر چلی گئی تو کیول نے مسکرا کر پوچھا۔

''پھر کچھ کام بنا تمہارا؟ تمہاری باتوں کی آواز تو مجھے اندر تک آرہی تھی''۔

''بس کیول یار باتیں ہی ہوئیں ہیں۔ مگر خالی باتوں سے تو کچھ بھی نہیں ہوتا''۔

مجھے بتاؤ میں اس کے علاوہ تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟''

میں نے کیول کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''جب وقت آئے گا تو میں تمہیں ضرور بتاؤں گا۔ اچھا اب میں چلا''۔

کیول کی دکان سے اپنے ریلوے پھاٹک والے ڈیرے تک میں سارا رستہ شانتا کوہلی کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ بڑی پیاری گول مٹول سی لڑکی ہے۔ اسے سرخ بندیا کتنی دلکش لگتی ہے۔ پھر موٹی موٹی آنکھیں چاند ایسا چہرہ ---- بالکل سانولا چاند!

واپس ڈیرے پر پہنچا تو گامی باکسر رنڈیوں کے بازار میں اپنی روز کی ڈیوٹی پوری

کر کے ابھی ابھی واپس آ کر منہ ہاتھ دھو رہا تھا اور یوسی پھینا کمبل اوڑھ کر چولہے کے سامنے اینٹ پر بیٹھا اسے کہہ رہا تھا۔

"باز آ جا گامی کنجرا۔۔۔۔۔ کیوں اپنے آپ کو تباہ کر رہا ہے۔ واپس گھر جا کر اپنی بیوی کو کیا منہ دکھائے گا"۔

رات کو یوسی پھینا شراب کی بوتل چارپائی کے نیچے رکھ کر بیٹھ گیا اور گلاس میں ڈالی ہوئی شراب کو غٹاغٹ حلق میں انڈیل کر فلم رتن کا مشہور گانا "مل کے بچھڑ گئیں اکھیاں"۔ گنگنانے لگا۔ راجگورو نے لحاف کے اندر پھٹا ہوا پرانا فوجی کمبل جوڑتے ہوئے پوچھا۔

"کس سے اکھیاں مل کے بچھڑ گئی ہیں تیری؟"

یوسی پھینا نے مونچھوں کو زبان سے چاٹ کر کہا۔

"اپنے سسر سے"۔۔۔۔۔۔۔۔۔

گامی باکسر اپنا گلاس لے کر اس کے پاس آ بیٹھا۔ یوسی نے مکار آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے گلاس میں شراب انڈھیل کر بولا۔

"اس کے بعد ایک قطرہ نہیں دوں گا"۔

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

6

ایک رات باہر خوب بارش ہو رہی تھی۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ کڑاکے کا پالا پڑ رہا تھا۔ میدان میں چاروں طرف کیچڑ ہو گیا تھا۔ لاریاں بارش میں کھڑی بھیگ رہی تھیں۔ کچھ کلینر لاریوں کے سارے شیشے چڑھائے اور پھٹے ہوئے لحافوں میں دھنسے سو رہے تھے۔ ہماری کوٹھڑی میں یوسی پھینا پیٹ بھر کر شراب پیئے اور اپنی بیوی اور سسر کو پہلے گالیاں دینے اور پھر محبت سے یاد کرنے کے بعد اپنی چارپائی پر بے سدھ پڑا خراٹے لے رہا تھا۔ گامی باکسر بھی سو رہا تھا۔

خواجہ بیندک اپنی چارپائی پر لحاف اوڑھے اکڑوں بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ راج گورو اپنے بچھونے پر ایک بوسیدہ اوراق والا رسالہ کھولے بیٹھا تھا اور اپنی پسندیدہ کہانی۔ "ڈرائیور کی داستان" پڑھ کر سنا رہا تھا۔ کوٹھڑی کے بلب جل رہے تھے۔ درمیان میں ایک کڑاہی رکھی تھی۔ جو بھوبل اور چھوٹے چھوٹے انگاروں سے بھری ہوئی تھی۔ خواجہ بیندک نے کانگڑی میں آگ بھر کر پاس رکھی ہوئی تھی۔ راج گورو نے مٹی کے پیالے میں آگ بھر کر پاس رکھ لی تھی اور کہانی سناتے سناتے وہاں ہاتھ بھی سینک لیتا تھا۔ میں اپنے بچھونے پر لحاف میں بیٹھا بڑے انہماک سے کہانی سن رہا تھا۔ خواجہ بیندک بیچ بیچ میں "ہوں" "اچھا" "بہت خوب" کے نعرے لگاتا جاتا تھا۔

یہ کہانی ایک انجن ڈرائیور کے بارے میں تھی جو روز شام کو گھر کے سامنے سے ٹرین لے کر گزرا کرتا اور دو فرلانگ کے فاصلے پر سے سیٹی بجا دیا کرتا۔ اس کے بچے سیٹی کی آواز سن کر اپنے باپ کو انجن چلاتا دیکھنے کے لئے گھر سے باہر نکل آتے۔ بیوی چھوٹے بچے کو گود میں لئے دروازے میں آ کر کھڑی ہو جاتی۔ باپ مسکرا کر ہاتھ ہلاتا۔ بچے خوشی سے تالیاں بجاتے۔ راج گورو اردو خوب سمجھ لیتا تھا۔ مگر اسے اردو پڑھنا بالکل نہیں آتا تھا۔ وہ بڑی بری طرح کہانی پڑھ رہا تھا۔ اٹک اٹک کر مشکل لفظ اٹھاتا۔ پھر رسالے پر جھک جاتا۔ بار بار دھوتی کے پلو سے ناک پونچھتا۔ مکالے اور مناظر قدرت کے ٹکڑوں کو ایک لمبے اور ایک ہی لہجے میں پڑھتا۔ چونکہ کہانی انگریزی افسانے کا ترجمہ تھی۔ اس میں انگریزی نام آ جاتے تو راجگورو رک

جاتا اور پھر انہیں اپنا ایک الگ نام دے کر آگے نکل جاتا۔ اس کے باوجود کہانی کو میں اور خواجہ بینڈکی بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے۔ کیونکہ راجگورو بڑی محبت اور شوق سے سنا رہا تھا اور کہانی تھی بھی مزے دار خاص طور پر بارش والی رات میں تو بڑی مزیدار لگ رہی تھی۔ باہر مینہ برابر پڑ رہا تھا۔ بارش کی بوندیں ہماری بند کھڑکی کے کواڑوں پر ٹپا ٹپ گر رہی تھیں۔ اور مجھے بارش میں بھیگتے بیری اور شیشم کے درختوں کا خیال آ رہا تھا۔ جہاں کہانی لکھنے والا افسانے کی ہیروئن کے سراپا کا نقشہ کھینچتا یا تعریف کرتا تو مجھے شانتا کوہلی کا خیال آ جاتا۔

میں سوچتا اس وقت شانتا اپنے بستر میں لحاف اوڑھے سو رہی ہو گی۔ کتنی سردی پڑ رہی تھی۔ وہ کتنی گرم ہو رہی ہو گی۔ گرم گرم سانس چل رہا ہو گا۔ اور ماتھے پر سرخ بندیا کا نشان انگارہ بن کر دہک رہا ہو گا۔ پاس ہی اس کے پتا جی ماتا جی اور بہن بھائی سو رہے ہوں گے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں اگر چپکے سے شانتا کے پاس چلا جاؤں تو ان لوگوں میں سے کوئی بھی اٹھ کر شور نہ مچائے؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ شانتا بھی مجھے اپنی چارپائی پر جھکا ہوا دیکھ کر شور نہ مچائے؟

گامی باکسر نے پہلو بدل کر کہا۔

"کیا تم لوگوں نے یوسف زلیخا کھول رکھی ہے!"

خواجہ بینڈکی نے ہنس کر کہا۔

"سو جا گامی۔ سو جا ماں دیا سوہن سنگھا۔"

بارش! بارش! بارش!

سردیوں کی رات کی بارش۔ تیز ہوائیں۔ جھولتے درخت۔ گرتے پتے۔ کیچڑ بھری گلیاں۔ سنسان بارش میں بھیگتے بازار۔ بند دکانوں کے پھٹوں پر آگ جلا کر ایک طرف کو دبکے ہوئے اونگھتے ہوئے چوکیدار۔ سوئی ہوئی گرم جسم والی شانتا اور میدان میں بھیگتی لاریاں، مینہ میں نہائے ہوئے ریلوے کے سگنلوں کی سرخ بتیاں اور انجن ڈرائیور کی کہانی! مجھے یہ سارا کچھ بڑا رومانٹک محسوس ہوا۔ میں نے ایک جھرجھری سی لی اور آنکھیں بند کر لیں۔ خواجہ بینڈکی بولا۔

"بٹ جی نیند آ گئی کیا!"

"نہیں تو"

میں نے جھٹ آنکھیں کھول دیں۔ کہانی ابھی آدھی ختم ہوئی تھی راجگورو نے باقی صفحے گن کر کہا۔

"بس تھوڑی سی رہ گئی ہے۔"

جب کہانی ختم ہوئی تو خواجہ بندھک سو چکا تھا۔ مجھے بھی نیند آنے لگی تھی۔ راجگورو نے بڑی احتیاط سے رسالہ تہہ کر کے اپنے ٹین کے ٹرنک میں رکھا اور لحاف میں لیٹتے ہوئے بولا۔

"ہے گامی مزیدار کہانی؟"

"بہت مزیدار۔"

"ایسی کہانی پڑھ کر آدمی کا ذہن کھل جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ دوسرے ملکوں کے لوگ بھی بالکل ہماری طرح محبتیں کرتے اور چھوٹی چھوٹی باتوں میں اپنی زندگیوں کے داؤ لگا دیتے ہیں۔ مثلاً اب اس انجن ڈرائیور کو ہی لے لو۔ کیا تم اس کی طرح اپنی ماں سے پیار نہیں کرتے؟ کیا میں اس کی طرح اپنی بیٹی سے محبت نہیں کرتا؟ اگر دیکھا جائے تو انسان انسان میں فرق ہی کیا ہے؟ اس گاڑی کا انجن ایک ہی ہے۔ صرف باڈی کا فرق ہے بٹ جی۔"

اس نے چاروں طرف سے اچھی طرح اپنے ارد گرد لحاف لپیٹ لیا۔

"بارش اسی طرح ہو رہی ہے۔ صبح گاڑیوں کے پھیرے لگانا وبال جان بن جائے گا۔ 2638 تو سٹارٹ ہی نہیں ہو سکتی۔ اس کا انجن جام ہو گیا ہو گا۔ اسے سٹارٹ کرنے کے لئے تو تھاپیاں سلگانی پڑیں گی۔"

اس طرح باتیں کرتے ہوئے راجگورو بھی سو گیا اور زور زور سے خراٹے لینے لگا۔ میں کچھ دیر تک جاگتا رہا اور مدقوق ڈرائیور کی کھانسی کی کھوں کھوں اور کھڑکی کے پٹ سے بارش کی بوندوں کے ٹکرانے کی آوازیں سنتا رہا اور شانتا کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر مجھے بھی نیند آنے لگی۔

دن چڑھ آیا مگر سورج نہ نکلا۔

آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ لیکن تیز سرد ہوا چل رہی تھی۔ بازار کیچڑ سے بھر گئے تھے۔ میدان میں پانی کھڑا تھا۔ ڈرائیور ٹھٹھرتے ہوئے کوٹھڑی سے نکل کر اپنی اپنی لاریوں کو دور سے دیکھ رہے تھے۔ کلینر لاریوں کو بڑی مشکل سے سٹارٹ کر

کے گھرر گھرر کرتے پانی سے باہر نکال کر سڑک پر لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں گرم کوٹ کے اوپر مفلر لپیٹے رجسٹر بغل میں دبائے، دونوں ہاتھ جیب میں دیئے پٹرول پمپ کے پاس کھڑا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ میرے لئے یہ سب کچھ محض تماشہ ہی تھا۔ تانگوں کے آگے جتے ہوئے گھوڑے نتھنوں سے بھاپ چھوڑتے کیچڑ پر دھپ دھپ پاؤں مارتے سڑک پر سے گزر رہے تھے۔ لوگ کمبلوں اور پرانے گرم کوٹوں میں لپٹے ٹھٹھر ٹھٹھر کر چل رہے تھے۔

سردار خاں روز پٹرول پمپ آجایا کرتا تھا۔ آج وہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ لحاف میں دبکا پڑا سو رہا ہو گا۔ مجھے یہ بارش کے بعد کا سارا منظر ایک ایک بھیگی ہوئی شے بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ چنانچہ میں خاص طور پر کھیتوں کا منظر دیکھنے کے لئے ایک لاری میں بیٹھ کر ہوائی اڈے کی طرف چل دیا۔ دیہات کے کچے مکانوں سے دھواں اٹھ کر وہیں جم سا گیا تھا۔ درخت بارش میں دھل کر نکھر گئے تھے۔ سخت سردی کے باوجود کہیں کہیں کسان کھیتوں میں ہل چلا رہے تھے۔ کماد کے کھیتوں میں گنے کے لمبے لمبے پتوں سے بارش کے قطرے چمٹے ہوئے تھے۔ ایک نہر کا پل آگیا۔ نہر منہ در منہ پانی سے بھری ہوئی تھی۔ اور اس کے کنارے کنارے سبزہ نکھر کر ہرا بھرا ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا اگر کوئی اس وقت نہر میں چھلانگ لگادے تو اس کا حشر کیا ہو؟ اس خیال ہی سے مجھے کپکپی آگئی۔ ہوائی اڈے پر کام بڑا سست ہو رہا تھا۔ مزدور سردی کے مارے کانپ رہے تھے۔ پھر بھی وہ بڑی جانفشانی سے کام کر رہے تھے۔ مزدور لڑکیوں میں سے آج ایک بھی وہاں نظر نہ آرہی تھی۔ معلوم ہوا سب چھٹی پر ہیں۔ عورت کو ہمیشہ چھٹی پر ہونا چاہئیے۔ اس لئے کبھی ہوائی اڈے پر آکر گیلے سیمنٹ کی کڑاہیاں نہیں ڈھونی چاہئیں۔ اس کا کام گھر رہنا ہے۔ بستر بچھانا اور چائے پکا کر بچوں کو پلانا ہے۔ لیکن جہاں بچھانے کو بستر اور پکانے کو چائے نہ ہو تو پھر گیلے سیمنٹ کی کڑاہی اٹھانی ہی ہیٹ پڑتی ہے۔ خواجہ بینڈک کو بڑی ناامیدی ہوئی۔ ایک تو باہر ہوا چل رہی تھی۔ دوسری اس کی مزدور محبوبہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ چنانچہ خواجہ اپنی گاڑی میں ہی کھڑکی کے شیشے چڑھا کر بیٹھا سگریٹ پیتا رہا اور مزدور روڑی اٹھاتے رہے۔ میں نے باہر نکل کر ایک چکر لگایا۔ اوور سیئر سے دو ایک باتیں کیں جو اپنے خیمے کے باہر آگ جلا کر کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور واپس اپنی گاڑی میں آکر خواجہ بینڈک کے پاس بیٹھ گیا۔

خواجہ نے پوچھا۔

"یہ سالا کیا کہہ رہا تھا؟"

"کہتا تھا سردی بڑھی ہے آج۔"

"اسے کہنا تھا پھر کیا خیال ہے تمہارا؟ بملا کماری کے ساتھ لگ کر بغل گرم کی جائے؟"

اس کے ساتھ ہی خواجہ نے اودر سیئر اور بملا کماری، دونوں کو موٹی موٹی گالیاں عطا کر دیں۔ میں خواجہ کے ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھ کر واپس شہر آ گیا۔ ہوٹل میں بیٹھ کر دوپہر کا کھانا کھایا اور یوں ہی آوارہ گردی کرنے شہر کے اس علاقے کی طرف نکل گیا جدھر شانتا کے باپ کی دکان تھی۔ اور شانت کا مکان تھا۔ بازار میں کیچڑ ہی کیچڑ تھا میرا جوتا اس میں بھر گیا۔ پھر بھی چلا جا رہا تھا۔ دسمبر کے ابر آلود آسمان تلے بھیگے درختوں کے ساتھ ساتھ چلنا بڑا رومانٹک ہوتا ہے۔ کیچڑ ہے تو پھر کیا ہوا۔ ہمارے اندر کوئی کم کیچڑ نہیں ہے۔ یہ کیچڑ ہمارے تمدن اور کلچر کا ایک حصہ ہے۔ ہمیں اسے قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔ جس طرح ہم کبھی کبھی ریوڑیاں اور میلے کچیلے گول گپے اور کلیجی کے کباب سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر کھا لیتے ہیں اور کبھی یہ محسوس نہیں کرتے ان ریوڑیوں گول گپوں اور کبابوں کو بڑے گندے لوگوں نے ہاتھوں سے مل مل کر بنایا ہے۔ اسی طرح ہمیں اپنے گلی کوچوں کے کیچڑ میں چلتے ہوئے کبھی شرم یا کراہیت محسوس نہیں کرنی چاہئیے۔ جب تک بازاروں میں گول گپے، مرمرا، چھولے، ریوڑیاں اور گزک بکتی رہے گی گلیوں میں کیچڑ بھی رہے گا۔ یہ دونوں کیچڑ ایک دوسرے کے ساتھ چلیں گے، جب لوگوں کا ماحول بدل جائے گا گلیوں سے کیچڑ بھی غائب ہو جائے گا۔ بہرحال اس کیچڑ سے جتنی جلدی چھٹکارا مل جائے اچھا ہے۔ میں اب خوشاب کی طرف جانے والی لائن کے پھاٹک پر کھڑا تھا۔ یہ لائن بھیگے ہوئے پتھروں کے خاکے دکھائی دے رہے تھے۔ پھاٹک معمولی سا تھا۔ لائن مین نے اپنی کوٹھڑی کی دیوار پر عشق پیچاں کی بیل چڑھا رکھی تھی۔ جس میں کہیں کہیں کاسنی رنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ یہاں چونکہ کچی سڑک پر مٹی بہت زیادہ تھی اس لئے اتنا کیچڑ نہیں ہوا تھا۔ اور زمین بارش کے پانی سے بھیگ کر سخت ہو گئی تھی۔ ہوا میں شیشم کے درختوں پر سے نسواری رنگ کے پتے جھڑ جھڑ کر گر رہے تھے لائن پار آبادی تھی ایک منزلہ دو منزلہ مکان ایک دوسرے میں گھسے ہوئے تھے۔ چھتوں پر گنوں کے سوکھے ٹانڈے پڑے تھے۔ انہی مکانوں میں کہیں شانتا

کا مکان بھی تھا۔ ریلوے کا پھاٹک اس آبادی کو شہر کی دوسری آبادی سے ملاتا تھا۔ کچھ دیر یونہی اس آبادی میں گھوم پھر کر شانتا کے مکان کے درشن کر کے اس کے باپ کو دکان کے اندر میلے بینچوں پر بیٹھے ہوئے مریضوں پر جھکا ہوا دیکھ کر واپس چل پڑا۔

جب میں پھاٹک عبور کر کے کھیتوں کے ساتھ ساتھ جانے والی کچی سڑک پر ہو کر شہر میں داخل ہوا تو میں نے سامنے سے شانتا کو آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں کتابیں تھیں۔ نسواری رنگ کی شال اوڑھ رکھی تھی اور چھوٹے چھوٹے متوازن قدم اٹھاتی اپنے گھر کی طرف چلی آرہی تھی۔ میں وہیں رک گیا جب وہ میرے قریب سے گزری تو میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"نمستے۔"

شانتا نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ پہچاننے کی کوشش کی اور پھر پہچان کر ذرا سا مسکرائی اور جواب میں آہستہ سے "نمستے" کہہ کر آگے چل دی۔ میں احمقوں کی طرح وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ پہلے اس کا منہ اور پھر اس کی پیٹھ دیکھتا رہا اور اپنے آپ پر لعنت ملامت بھیجتا رہا کہ میں نے آگے کوئی بات کیوں نہ کی؟ جب آگے کچھ نہیں کہا تھا تو اب پیچھے جانا مزید حماقت تھی۔ چلو اتنا تو ہوا کہ اس نے میری شکل کو یاد رکھا۔ اگر عشق سچا ہے تو ایک دن بات آگے بھی چل پڑے گی۔ عشق تو میرا واقعی سچا تھا صرف میں جھوٹا تھا اور شانتا کوہلی سے جعلی عشق کر کے اس کے بھرے بھرے رخساروں کا واقعی لطف اٹھانا چاہتا تھا۔

اس واقعے کی خبر میں نے کیول سیٹھی کو جاتے ہی کر دی اس نے خوش ہو کر کہا۔

"تم نے بہت اچھا کیا جو اسے نمستے کہہ دیا شریف لڑکیاں اس قسم کے اخلاق کو بہت پسند کرتی ہیں۔"

کیول نے چائے منگوائی میں نے چائے کی پیالی تھام کر کہا

"مگر بھائی آگے بھی کچھ ہونا چاہیئے خالی نمستے سے کیا ہوتا ہے؟"

کیول نے مسکرا کر کہا۔

"شانتی کرو بھگوان نے چاہا تو آگے بھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔"

"لیکن بھگوان کب چاہے گا۔"

"جب تم ہمت سے کام لو گے۔"

"ہمت کیا میں تو اس کے عشق میں گدھے سے بھی کام لے سکتا ھوں۔"

کیول! کیا تم اس پر میرے دل کا حال نہیں کہہ سکتے؟"

کیول نے کچھ سوچ کر کہا۔

"ایسا ہو تو سکتا ہے مگر ڈرتا ہوں کہیں شانتا برا نہ مان جائے اور اپنے پتا کو جا کر بتا نہ دے سوچو پھر کتنی بری بات ہو گی۔ گاہک بھی ہاتھ سے جائے گا اور عزت بھی۔

میں چپ ہو گیا۔ کیول بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ وہ تو بے چارا میرے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ مگر اس بات میں بدنامی کا بڑا خدشہ تھا۔ محبت کے اس جذبے سے کام لینا ہو گا جو اگر سلامت ہو تو شاعر نے کہا ہے کہ

کچے دھاگے سے بندھی آئے گی سرکار میری

اور اگر ایسا نہ ہوا تو بس پھر میرا ایک ہی کام ہو گا کہ کہیں نہ کہیں سے اس شاعر کو تلاش کروں اور کلہاڑا مار کر اس کے سر کے دو ٹکڑے کر دوں۔

اسی رات میں نے شانتا کو بلی کے نام ایک پریم بھرا خط لکھا اس خط میں میں نے شانتا کو صاف صاف لکھ دیا کہ میں اس سے بے پناہ محبت کرتا ہوں اور اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ بھگوان کے لئے وہ مجھے کہیں نہ کہیں ملے اور میرے پریم کو اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ خط تہہ کر کے میں نے جیب میں رکھ لیا اور دوسرے روز ٹھیک وقت پر اس جگہ جا کر کھڑا ہو گیا جہاں میں نے شانتا کو سکول سے واپس آتے دیکھا تھا۔

اس روز کی طرح شانتا عین وقت پر مجھے کتابیں کاپیاں اٹھائے واپس گھر کو آتی دکھائی دی۔ میرا دل دھڑکنے لگا اور سر کی سینڈل والی رگ پھڑکنے لگی۔ یا خدا میری مدد کرنا۔ یا بھگوان میری سہائتا کرنا، او گاڈ میری ہیلپ کرنا۔ اگر مجھے چینی زبان آتی تو میں اس زبان میں بھی خدا سے گڑگڑا کر مدد کا طلب گار ہوتا۔ شانتا جوں جوں قریب آ رہی تھی میرا دل دھڑک رہا تھا۔ اور جیب میں پڑے ہوئے محبت نامے کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ شانتا بالکل قریب آ گئی۔ مجھے اس کی موٹی موٹی آنکھوں پر جھکی ہوئی پلکیں اور سردی میں ٹھٹھرے ہوئے ہونٹ صاف نظر آنے لگے۔ آسمان ابر آلود تھا ہوا سرد تھی۔ لائن پار والی آبادی میں ایک کتا بھونک رہا تھا۔ شیشم کے درختوں پر طوطے بول رہے تھے۔ شانتا اب سامنے تھی۔ لو وہ آ گئی۔ خط نکالو گدھے جلدی سے نکالو۔ نہیں پہلے ہاتھ جوڑ کر نمستے کرو۔

''نمستے۔''

شانتا نے ایک بار پھر مجھے دیکھا۔ مسکرا کر نمستے کا جواب ''نمستے'' میں دیا اور آگے روانہ ہو گئی۔ بھاگو! بھاگو! اٹھو جلدی کرو۔ وگرنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ گنگا بہہ رہی ہے۔ دو چلو بھر لو۔ میں نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''شانتا جی! ایک بات سنو۔''

''کیا ہے جی؟''

شانتا کا سبھاؤ بڑا میٹھا تھا۔ کاش خط ملنے کے بعد بھی یہی سبھاؤ رہے کہیں ہاتھ سینڈل کی طرف نہ اٹھ جائے! میں نے جیب سے خط نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

''میرے پاس آپ کی ایک چیز پڑی تھی۔ سوچا آپ کو دے دوں''

شانتا نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہ کیا ہے جی۔''

''آپ گھر جا کر پڑھ لیں اسے۔''

''اچھا جی۔''

شانتا نے بڑے بھولپن سے کہا اور خط لے کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

''اچھا نمستے۔''

''نمستے جی۔''

شانتا چلی گئی۔ میں خوشی سے بلیوں اچھلتا ہوا دل لے کر واپس روانہ ہو گیا۔ بس اب کام بن گیا تھا۔ شانتا ضرور سمجھ گئی ہو گی۔ آخر وہ بھی پڑھی لکھی جوان لڑکی ہے اور بالغ بھی ہے۔ اتنی احمق نہیں ہو سکتی کہ خط دینے کا مطلب ہی نہ سمجھ سکے۔ کل وہ ضرور اس خط کا جواب دے گی۔ میں بھاگ کر کیول کے پاس آ گیا اور اسے اپنے کارنامے کی خبر کی۔ کیول نے خوش ہو کر کہا۔

''بس اب میدان مار لیا۔۔۔۔ لیکن کل جب جاؤ تو بڑی احتیاط سے بات کرنا اور کہنا کہ پریم کا اپنا اپنا ایک الگ مذہب ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا کہ ہر مذہب آپس میں پریم کرنا سکھاتا ہے۔ میں بھی اسی طرح تم سے اور تمہارے مذہب سے پریم کرتا ہوں اور مجھے سوائے تمہارے پریم کے اور کچھ نہیں چاہیئے۔ سمجھ گئے ناں؟''

طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

"بالکل بالکل ۔۔۔۔۔ تم فکر نہ کرو۔ میں پوری طرح معاملات کو سوچ سمجھ کر بات کروں گا۔"

"ہاں تمہیں باتیں بڑی عقل مندی سے کرنی چاہئیں۔ عورتیں بیوقوف مردوں کو کبھی برداشت نہیں کرتیں میں نے کئی ایسے لوگ دیکھے ہیں جو محض اپنی بیوقوفی کی باتوں سے بڑی بڑی خوبصورت عورتوں سے محروم ہو گئے۔"

"فکر نہ کرو کیول! میں تو ہر بات کا بتنگڑ بنا سکتا ہوں۔"

"ایسا ھی ھوگا۔"

اگلے روز آسمان صاف تھا اور چمکیلی اور خوشگوار دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں کوئی آدھ گھنٹہ پہلے ہی خوشاب والے پھاٹک پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں ذرا تخلیہ ہوتا تھا اور اس بات کا ڈر نہیں تھا کہ اگر شانتا مجھے پریم بھرا خط دے یا مجھ سے محبت کی باتیں کرے تو کوئی ہمیں دیکھ لے۔ ٹھیک وقت پر شانتا سامنے سے آتی دکھائی دی۔ اس نے پیلے رنگ کا سوئٹر، سفید قمیض اور سفید شلوار پہن رکھی تھی۔ سر پر سفید دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان جوں جوں فاصلہ کم ہو رہا تھا میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ خدا جانے جب یہ فاصلہ ختم ہو اور آمنا سامنا ہو تو کیا ہو! بم پھٹے یا پھول کھلیں! میرے گلے میں شانتا کی باہیں حمائل ہوں یا میرے سر پر اس کا جوتا پڑے۔ میرا دل بھی دھڑک رہا تھا اور سر پر سینڈل والی رگ بھی بری طرح پھڑک رہی تھی۔ شانتا نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ پھولا ہوا ہے۔ اور رنگ سرخ ہو رہا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ پانسہ الٹ پڑ گیا ہے اور اب سر کی خیر نہیں معاملہ چوپٹ ہو گیا تھا۔ اب کیا ہو سکتا تھا؟ میں نے سوچا بھاگ چلو پیارے! عشق تو ہو چکا اب سر کو بچاؤ، شانتا اب میرے بالکل قریب آ گئی تھی۔ بس چند قدموں کا ہی فاصلہ رہ گیا تھا۔ میرے پاؤں زمین میں گڑ گئے تھے میں نے بھاگنا چاہا مگر پتھر بن کر رہ گیا۔ شانتا میرے قریب سے غصے میں پھولی چپ چاپ میری طرف دیکھے بغیر سر جھکائے گزر گئی۔

جانے کیسے میرے منہ سے "نمستے" نکل گیا۔

شانتا نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں چپ چاپ کھڑا رہا۔ شانتا آگے نکل گئی۔ کوئی دس قدم کے فاصلے پر اس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور ہاتھ سے ایک چھوٹا سا رقعہ زمین پر گرا دیا۔ میں حیران رہ گیا۔ بھاگ کر رقعہ اٹھایا۔ اور پھر ادھر ادھر دیکھا کہ کسی نے دیکھ تو نہیں لیا۔ وہاں

کوئی نہیں تھا۔ بجلی کے کھمبے پر ایک کوا بیٹھا اپنی مکار آنکھوں سے سر جھکائے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے رقعہ کھول کر پڑھا۔

"آپ نے ایسا کیوں لکھا جی؟ کیا میں کوئی ایسی ویسی لڑکی ہوں؟ بھلا مجھے آپ سے کیوں پریم ہونے لگا؟ نہ جی نہ میں پریم نہیں کر سکتی بھگوان کیا کہیں گے؟ میں آپ سے نہیں مل سکتی پتا جی کو معلوم ہوا تو کیا کہیں گے؟ خبردار جو مجھے پھر خط لکھا جی۔ کیا اسی لئے کیول کی دکان پر مجھ سے باتیں ہوئی تھیں؟ میں بھی کہتی کہ یہ روز روز یہاں کیوں کھڑے۔ روز روز نمستے کیوں ہوتی ہے؟ نہیں جی نہیں میں پریم نہیں کر سکتی۔ اگر آپ کو مجھ سے ملنا ہی ہے تو میں کیسے مل سکتی ہوں جی؟ اچھا تو میں کل اسکول سے جلدی آجاؤں گی آپ بارہ بجے یہاں میں میں ذرہ پوچھوں گی کہ آخر آپ نے مجھے کیا سمجھ لیا۔" شانتا۔"

میری کشتی ڈوب کر ابھر آئی تھی۔ قلعے کی دیوار میں پہلا شگاف پڑ گیا تھا۔ وہ وقت دور نہیں تھا جب میری فوجیں فاتح کی حیثیت سے اس قلعے میں داخل ہو جائیں گی۔ میں نے پھاٹک کی پرلی طرف دیکھا شانتا آبادی والے مکانوں کے پاس جا رہی تھی۔ میں نے رقعہ چوم لیا کھمبے پر بیٹھا ہوا کوا کائیں کائیں کرنے لگا۔

"بکواس بند کر کمینے؟"

میں وہاں سے خوشی خوشی سر پر پاؤں رکھ کر کیول سیٹھی کی دکان کی طرف بھاگا۔ اس کی دکان پر گاہک کھڑے سودا خرید رہے تھے۔ کیول میرے چہرے پر کھلی ہوئی مسرت کی چمک کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ میں کامیاب ہو کر لوٹا ہوں۔ وہ میری طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر مسکرایا۔ جب گاہک چلے گئے تو اس نے پوچھا۔

"معلوم ہوتا ہے کام بن گیا ہے تمہارا۔"

میں نے جیب سے شانتا کا خط نکال کر سامنے رکھ دیا۔ کیول سیٹھی نے دراز میں سے عینک نکال کر لگائی اور بڑے غور سے خط پڑھنے لگا۔ خط پڑھنے کے بعد وہ ہنسا۔

"بڑی بھولی لڑکی ہے بہر حال تم سے پریم ضرور کرتی ہے۔ اب کل اسے کہاں لے کر جاؤ گے؟"

"کیا وہ میرے ساتھ کہیں چلی جائے گی۔"

"کیول نے ناک سکیڑ لی۔ ماتھے پر انگلی رگڑ کر بولا۔

میرا خیال ہے اس نے تمہارے ساتھ کہیں جا کر بیٹھنے کے لئے یہ خط لکھا ہے۔ اور وہ اسی مقصد کو لے کر اسکول سے آئے گی۔"

"پھر میں اسے کہاں لے کر جاؤں؟"

"کریسنٹ ہوٹل کے کیبن میں لے جانا۔ اگر وہ چلی گئی تو؟"

"میں پوری کوشش کروں گا۔"

"زیادہ زور مت دینا۔ ابھی کھیر گرم گرم ہے۔ ایک دم کھانے کی کوشش کرو گے تو زبان جل جائے گی۔"

میں نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

"اگر شانتا کی کھیر سے جلتی ہے تو ہزار بار جل جائے۔"

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

7

رات کو جب دوسرے ڈیرے پر سے ڈرائیوروں کے پھیرے درج کر کے واپس اپنے ڈیرے پر آیا تو وہاں سردار خان اور باقی ڈرائیور سر جوڑ کر بیٹھے تھے۔ معلوم ہوا کہ پی بی ایل 8362 کا مدقوق ڈرائیور گاڑی لے کر ابھی تک ہوائی اڈے سے واپس نہیں آیا سب کو فکر اور تشویش ہو رہی تھی کیوں کہ اس وقت رات کے پونے گیارہ ہو چکے تھے۔ سردیوں کے پونے گیارہ بڑا وقت ہوتا ہے۔ سردار خاں نے پوچھا۔

"اوئے خواجہ تم نے اسے آخری پھیرا لے جاتے کہاں دیکھا تھا؟"

خواجہ پینڈک نے سگریٹ کا گل پھونک مار کر جھاڑتے ہوئے کہا۔

"چک نمبر 25 کے پل پر دیکھا تھا۔"

پھر خان نے مجھ سے پوچھا۔

"8362 نے پٹرول کتنا ڈلوایا تھا بٹ جی؟"

میں نے رجسٹر کھول کر دیکھا اور بتایا۔

"دس گیلن۔"

گامی بولا۔

"تیل تو اس کے پاس بہت ہو گا۔ کوئی اور خرابی نہ ہو گئی ہو۔"

راجگورو نے کہا۔

"کل کہہ رہا تھا کہ فین بیلٹ کام نہیں کر رہی۔"

خان نے پوچھا۔

"اس کو کیا ہو گیا تھا؟"

راجگورو نے کہا۔

"بیلٹ کے دو جائنٹ اکھڑ گئے تھے۔"

"تو اس نے رپورٹ کیوں نہیں کی۔ ورکشاپ سے نئی بیلٹ ڈلوا لیتا۔"

خواجہ پینڈک بولا

"خاں جی آپ جانتے ہیں کہ وہ بیمار آدمی ہے۔ زندگی سے بیزار پھرا کرتا ہے وہ۔ بیلٹ کی اسے کیا خبر ہو گی؟"

سردار خاں نے ہاتھ ہلا کر کہا۔

"تو پھر گھر سے ڈرائیوری کرنے کیوں آ گیا۔ ماں کے پاس بیٹھا رہتا۔"

راجنورو نے ناک سے سوں سوں کر کے کہا۔

"سوال یہ ہے کہ اب اس کی کیسے خبر لی جائے؟

سردار خاں سر جھٹک کر بولا۔

"سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ گاڑی لے کر ہوائی اڈے کا راستہ دیکھا جائے۔ وہیں کہیں پڑا ہو گا گاڑی میں۔"

گامی بولا۔

"کہیں اس کا اپنا ہی ٹائر نہ پھٹ گیا ہو۔"

خواجہ مینڈک غرایا۔

"بکواس بند کرو گامی کنجرا۔ منہ اچھا نہ ہو تو بات اچھی کر لیا کرو۔"

چنانچہ اسی وقت گاڑی باہر نکالی گئی۔ گاڑی میں ایک رسہ رکھ لیا گیا کہ اگر گاڑی خراب ہو گئی ہو تو اسے کھینچ کر لایا جائے۔ خواجہ مینڈک نے اسٹیرنگ سنبھالا۔ سردار خاں اور میں دونوں اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ خواجہ نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم رات کے کوئی ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ہوائی اڈے کی طرف روانہ ہو گئے۔ جو چھوٹی سی سڑک ہوائی اڈے کی جانب جاتی تھی۔ وہ اگرچہ پکی تھی مگر اس پر روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ خواجہ نے شہر سے نکلتے ہی پچاس میل کی رفتار پر گاڑی چھوڑ دی کیونکہ راستہ بالکل سنسان تھا۔ چاند کہیں بھی نہیں تھا۔ رات بے حد سرد اور بے حد نکھری ہوئی تھی۔ دو تین دن پہلے کی بارشوں نے راتوں کو برفیلا کر دیا تھا۔ آسمان گہرا نیلا ہو رہا تھا اور ستارے بڑی تیزی سے چمک رہے تھے۔ سڑک کی دونوں جانب کیکر کے خاردار درخت بھوت بن کر کھڑے تھے۔ کھیتوں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا اور اس اندھیرے میں نکھری ہوئی رات کی سرد فضا اوس گرا رہی تھی اور سردی بے حد ہو رہی تھی۔

ہم کوئی آدھے سے زیادہ راستہ طے کر گئے مگر پی بی ایل 8362 کا نشان تک بھی

دکھائی نہ دیا۔ سردار خاں بولا۔

"خدا خیر ہی کرے یار خواجہ ۔۔۔۔۔ آدمی وہ بڑا روگی ہے۔ کہیں سردی نہ لگ گئی ہو

خواجہ سٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔

"مگر خاں جی اس کا کلینر تو گاڑی لے کر شہر آسکتا تھا۔"

"خدا جانے اب اصل بات کیا ہوئی ہے۔"

ہوائی اڈہ کوئی تین میل دور رہ گیا ہو گا کہ ہماری گاڑی کی روشنیوں نے سامنے کوئی فرلانگ فاصلے کے بعد کنارے کھڑی ایک گاڑی کی نشان دہی کی۔

خواجہ بینڈک بولا۔

"گاڑی تو وہ کھڑی ہے خاں جی۔"

سردار خاں نے آنکھیں سکیڑ کر شیشے کی طرف آگے کو جھک کر دیکھا اور بولا۔

"گاڑی تو 8362 ہی ہے خاں جی۔"

ہم نے اپنی گاڑی اس گاڑی کے پاس جا کر کھڑی کر دی۔ ہم کھڑکی کھول کر باہر نکلے۔ چاروں طرف گہرا سناٹا طاری تھا۔ کہیں بھی کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ سردی کہرا بن کر ہاتھوں اور چہروں پر جمتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ پی بی ایل 8362 کی تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ سردار خاں نے ماچس جلا کر شیشے میں سے اندر جھانک کر دیکھا اور ہنس کر بولا۔

"گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں۔"

اندر کلینر اور مدقوق ڈرائیور کمبل تان کر سو رہے تھے۔ سردار خاں نے کھڑکی پر دو تین مکے مار کر انہیں جگایا۔ کلینر بڑبڑا کر اٹھا اور سر پر گلوبند لپیٹتا باہر نکل آیا۔

"اوئے کیا ہو گیا تھا اوئے دلیا؟"

کلینر نے منہ لٹکا کر نیند بھری آواز میں کہا۔

"فین بیلٹ ٹوٹ گیا تھا خاں جی۔"

اتنے میں مدقوق ڈرائیور بھی کمبل کی بکل مار باہر آ گیا۔

"ماما جی جب تمہیں پتا تھا کہ اس کی فین بیلٹ کے جائنٹ اکھڑ گئے تو تم نے نئی کیوں نہیں ڈلوالی؟"

مدقوق ڈرائیور سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے بیڑا بنا کھڑا گیا تھا۔ اس نے کمزور سی آواز میں کہا۔

''سارا دن ٹھیک کام کرتی رہی تھی۔ خدا جانے آخری پھیرے پر اسے کیا ہو گیا۔''

خواجہ بینڈکٹ نے نیا سگریٹ سلگا کر اسے مٹھی میں پکڑ کر زور سے کش لگا کر کھانستے ہوئے کہا۔

''ماما جی تمہیں کچھ دنیا جہان کی بھی خبر ہوتی ہے یا نہیں۔''

سردار خان نے کہا۔

''چلو اب اس سالی کورسے کے ساتھ باندھو۔ ساری رات حرام کر دی اس بک بک نے۔''

کلینر اور دونوں ڈرائیور مل کر بگڑی ہوئی لاری کورسے کے ساتھ ہماری گاڑی کے ساتھ باندھنے لگے۔ میرے لئے یہ کام غیر دلچسپ تھا۔ سردار خاں اوور کوٹ میں لپٹا سگریٹ ہاتھ میں لئے ٹھٹھرتا ہوا ان لوگوں کے سر پر کھڑا انہیں ضروری ہدایتیں دے رہا تھا۔ میں وہاں سے ہٹ کر قریب ہی ایک کیکر کے پتلے پتلے درختوں کے درمیان بہنے والی چھوٹی سی نہر کے کنارے آ کر کھڑا ہو گیا۔ کیکر کی گیلی ٹہنیوں پر سے اوس کی بوندیں چپکے چپکے نیچے گھاس پر گر رہی تھیں۔ ندی کا مٹیالا پانی بڑی خاموشی سے اپنی منزل کو رواں تھا۔ درختوں کی ننگی ٹہنیوں میں سے گہرے نیلے آسمان پر پھول ایسے کھلے ہوئے ستارے بھڑک بھڑک کر چمک رہے تھے۔ ان میں سے کوئی ستارہ چھوٹا اور کوئی بڑا۔ کوئی سرخ لو دے رہا تھا تو کوئی نیلی چمک دے رہا تھا۔ رات بڑی بھیگی ہوئی تھی۔ بڑی ٹھنڈی ٹھنڈی اور بڑی پر اسرار تھی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی جنگل کی شہزادی چشمے پر نہا کر اپنے بال سکھا رہی ہے۔ میں شانتا کے بارے میں سوچنے لگا کہ صبح جب وہ ملے تو اسے کہاں لے کر جاؤں؟ اور اگر جگہ مل بھی جائے تو کیا وہ چلنے کو تیار ہو جائے گی؟ مجھے شانتا کے بھرے بھرے گرم جسم کا خیال آ گیا اور میرے جسم میں گرم خون کی رو دوڑ گئی۔

مرمت طلب گاڑی کورسہ باندھ کر لاری سے باندھ دیا گیا تھا۔ مدقوق ڈرائیور اور اس کا کلینر اسی گاڑی میں بیٹھے رہے۔ ہم اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ خواجہ بینڈکٹ نے خدا کا نام لے کر گاڑی اسٹارٹ کی اور بڑی ہلکی رفتار پر پچھلی گاڑی کو ساتھ لے کر چل پڑا۔ آدھ گھنٹے کا راستہ

ہم نے گھنٹہ بھر میں طے کیا۔ ڈیرے پر واپس آئے تو دوسرے ڈرائیور ہمارے انتظار میں تھے۔ مرمت طلب گاڑی کو میدان میں لا کر کھڑا کر دیا۔ سردار خاں لمبے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ٹھنسائے، ٹھٹھرتا ہوا اپنے ہوٹل کی طرف چل دیا اور ہم لوگ اپنی کوٹھڑی میں آ کر سو گئے۔ مدقوق ڈرائیور فین بیلٹ کے ٹوٹنے کے حادثہ کو بار بار سناتا رہا۔ خواجہ بینڈک اس کی بیوقوفیوں اور نکمے بننے پر اسے لعن طعن کرتا رہا اور میں شانتا سے اپنی صبح کو ہونے والی ملاقات کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر مجھے نیند آ گئی۔ مگر مدقوق ڈرائیور فین بیلٹ کا قصہ سناتا رہا۔

میں صبح کو اٹھا۔ پٹرول پمپ پر جا کر ساری لاریوں میں ڈالے جانے والے پٹرول کا اندراج کیا۔ دس سے ساڑھے گیارہ بجے تک کیول کی دکان پر بیٹھا اس سے شانتا کہ بارے میں باتیں کرتا رہا۔ ساڑھے گیارہ بجے کے بعد میں وہاں سے اٹھا اور خوشاب ریلوے لائن کے پھاٹک پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ بارہ بجے تو دل دھڑکنے لگا۔ کوئی سوا بارہ بجے شانتا اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ میں وہاں سے ذرا پرے درخت کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔ شانتا نے بھی مجھے دور سے دیکھ لیا تھا۔ آج اس کے چہرے پر نہ تو غصہ تھا اور نہ ہی مسکراہٹ ------ بڑی سنجیدہ چلی آ رہی تھی۔ لباس وہی کل والا ہی تھا۔ شلوار اور قمیض کل سے کچھ کچھ میلی ہو رہی تھی۔ جب وہ میرے قریب آ گئی تو میں نے ہاتھ اٹھا کر نمستے کہا۔ شانتا نے بھی نمستے کہا۔ اور ادھر ادھر دیکھ کر میرے پاس درخت کی اوٹ میں آ کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ بڑے برے ہیں جی!"

اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

میں نے نرمی سے پوچھا

"مجھ سے کیا غلطی ہو گئی شانتا؟"

"آپ نے ایسا پتر کیوں لکھا؟"

"کیا پتر لکھنا گناہ ہے؟"

"کیوں نہیں یہ تو مہا پاپ ہے۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتا شانتا۔ میں تو پریم کا دیوانہ ہوں ---- پریم کرتا ہوں اور پریم ہی کرتا رہوں گا۔---- خواہ کتنا گناہ ہو خواہ ثواب ھو۔"

WWW.PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام
PAKISTANIPOINT
ایک رابطہ اپنوں سے
پاکستانی پوائنٹ

شانتا نے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا۔

"بھگوان کے لئے آپ کیا کر رہے ہیں ---- کوئی دیکھ لے تو کیا ہو؟"

"تو چلو کہیں چل کر بیٹھ کر باتیں کریں۔"

"ہائے میں مری ------ میں کیسے جا سکتی ہوں آپ کے ساتھ۔"

"تو پھر میں پہلے چلا جاتا ہوں۔ تم میرے بعد وہاں آ جانا۔"

کہاں بھلا؟"

"کریسنٹ ہوٹل۔"

"اگر کسی نے دیکھ لیا تو پتاجی میرا کچومر نکال دیں گے۔ ناں جی میں نہیں جاتی۔"

"لیکن گھر جا کر کیا کہو گی؟ تم سکول سے ایک گھنٹہ پہلے آ گئی ہو۔"

"کیوں اتنا اچھا سنہری موقع ضائع کر رہی ہو شانتا۔"

"نہیں جی میں نہیں جا سکتی بالکل نہیں جا سکتی۔ کبھی نہیں جا سکتی۔ نہیں -------- نہیں ------ نہیں ----"

لیکن شانتا نے میری ایک نہ سنی، اور وہ چلی گئی۔ میں نے واپس آ کر کیول سیٹھی سے ایک بار پھر مشورہ کیا اور دوسرے روز شانتا کے سکول کے باہر جا کر کھڑا ہو گیا۔ اسکول میں چھٹی ہونے والی تھی اور کچھ تانگے لڑکیوں کو واپس گھر لے جانے کے لئے کھڑے تھے۔ گھنٹی بجی لڑکیاں باہر نکلنا شروع ہو گئیں۔ شانتا اپنی کچھ سہیلیوں کے ساتھ باہر نکلی۔ اس نے مجھے دیکھا تو ذرا مسکرائی اور پھر اپنی سہیلیوں کی ساتھ------

----

باتیں کرتی ہوئی چلی گئی اور میں بھی پیچھے روانہ ہو گیا۔ نہر کے پل کے اس طرف شانتا کی سہیلیاں اس سے جدا ہو گئیں۔ اب میں شانتا کے پاس چلا گیا۔

"بھگوان کے لئے میرے پاس نہ آئیں کسی نے دیکھ لیا تو مصیبت آ جائے گی۔"

"فکر نہ کرو۔ ہمیں کوئی نہیں دیکھ رہا۔ اس علاقے کے سب لوگ سورداس ہیں۔"

"میرے ساتھ آؤ ------ ہم نہر والے راستے سے چلتے ہیں۔"

"ادھر سے میرا گھر دور ہے۔"

"پھر کیا ہوا ------ کل جلدی گھر پہنچ گئی تھیں۔ آج ذرا دیر سے چلی جانا۔"

تھوڑے سے انکار کے بعد شانتا میرے ساتھ نہر کے کنارے چل پڑی ------- میں اس سے باتیں کرنے لگا ------ پریم کی باتیں ------ سکول کی باتیں ------ سرگودھا شہر کی ------ ہومیو پیتھی اور محبت کی باتیں -------

میں نے سوچا اس ہندو لڑکی کے دل پر اپنا جادو چلانے کے لئے ضروری ہے کہ میں ایک پل کے لئے ہندو بن جاؤں ------ چنانچہ میں نے کرشن جی مہاراج اور رام چندر جی کی تعریفوں کے پل باندھنے شروع کر دیئے۔

''کرشن؟ اجی کرشن مہاراج تو ہندوستاں کے سب سے بڑے اوتار تھے۔ جس طرح وہ انگلی کے گرد چکر گھما کر چھوڑا کرتے تھے۔ میں نے تو ایسا چکر چلتے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ اور رام چندر تو بڑا گریٹ آدمی تھا ------ اتنا بڑا بادشاہ پھر کبھی پیدا ہی نہیں ہوا ------- سب سے پہلا ہوائی جہاز اسی نے تو بنایا تھا ------''

شانتا پر ان باتوں کا بڑا خوش گوار اثر ہو رہا تھا۔ اور اب وہ بڑے اطمینان کے ساتھ میری باتیں سن رہی تھی اور ان کا جواب بھی دے رہے تھی --- کسی وقت میری طرف مسکرا کر بھی دیکھ لیتی۔ میں ہندو اوتاروں اور بادشاہوں کی تعریف میں اتنا آگے نکل گیا کہ راون کی بھی تعریفیں کرنے لگا۔

''اور راون! ------ واہ واہ کیا کہنے ہیں اس کے۔ بارہ ہاتھ بارہ سر ------ میں نے اتنی خوبصورتی سے گردنوں کے ساتھ لگے ہوئے سر آج تک نہیں دیکھے اور وہ بہادر بھی کتنا تھا! معلوم ہوتا ---------؟

شانتا نے حیرانی سے مجھے دیکھا اور بولی۔

''مگر وہ تو راکھشش تھا۔ اس نے سیتا میا کو اٹھا لیا تھا۔ وہ تو ظالم تھا ------ اس کے ساتھ تو ہمارے رام جی نے یدھ کیا تھا ------''

ارے میں یہ کیا کہہ گیا --- تو راون ظالم تھا ------ میں نے فوراً'' پینترا بدلا ------

''او آئی ایم ساری ------ میں اسے شیو جی سمجھ بیٹھا تھا۔ راون کا میرے سامنے نام نہ لینا شانتا ------ ایسے ظالم اور وحشی آدمی کا نام سننا بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ بڑا کمینہ تھا۔ اگر مجھے کہیں مل جائے تو میں پی بی ایل 8362 کا کلینر بنا کر رکھ دوں۔ حرامزادے نے

اپنے آپ کو سمجھ کیا رکھا تھا کہ سیتا میا کو اٹھا کر لے گیا۔۔۔۔۔۔ بدمعاش کہیں کا۔۔۔۔۔۔

شانتا خوش ہو گئی۔ میں اسی طرح بڑے بڑے مزے سے اس کے ساتھ باتیں کرتا نہر کے کنارے ساتھ ساتھ جا رہا تھا، کہ اچانک کسی نے مجھے آواز دی۔

"بٹ جی۔۔۔۔؟"

میں نے سر اٹھا کر دیکھا، نہر میں لاری کھڑی کئے پی بی ایل 3222 کا ڈرائیور گامی باکسر اسے دھو رہا تھا، اور میری طرف مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔

"بٹ جی کوئی گاڑی وغیرہ چاہئیے تو لاؤں۔"

"نہیں بھئی شکریہ!"

گامی کمینہ مسکراتا رہا اور میں گھبرا کر شانتا کو ساتھ لئے آگے جلدی جلدی نکل گیا۔

"کون تھا یہ؟" شانتا نے پوچھا۔

"ہماری کمپنی کا ڈرائیور ہے۔"

"ہاں تو میں تمہیں کہہ رہا تھا کہ راون بڑا کمینہ آدمی تھا۔ جس نے ایک بیاہتا استری پر ہاتھ ڈالا۔ میں تو اس بدمعاش کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ اور کرشن مہاراج کا تو انڈیا میں جواب نہیں۔

اور پھر گوتم بدھ۔۔۔۔۔ اوم! شانتی! شانتی! شانتا! شانتا!

"آپ بڑی دلچسپ باتیں کرتے ہیں۔" ۔۔۔۔۔ شانتا نے ذرا ذرا مسکراتے ہوئے کہا۔

محمد طارق اقبال
پاکستانی ڈائجسٹ
ڈاٹ کام

"پھر کب ملو گی شانتا! میں تمہیں اس سے بھی زیادہ دلچسپ باتیں سناؤں گا۔"

"رام رام! میں اب نہیں مل سکتی بھٹ جی۔"

"رام رام! میں بھٹ نہیں بٹ ہوں شانتا۔"

"ایک ہی بات ہے بھٹ جی۔"

نہر کا وہ پل آ گیا جہاں سے شانتا کا مکان بالکل نزدیک تھا۔

"اب آپ چلے جائیں۔ پتا جی نے دیکھ لیا تو مصیبت آ جائے گی۔"

"میں کل پھر آؤں گا شانتا۔"

"نہیں نہیں بھگوان کے لئے نہیں۔"

"تم کیول کی دکان پر آجانا۔ اس کی پچھلی کوٹھڑی بڑے مزے دار ہے موٹے کاغذوں والی کاپیوں سے بھری ہوئی ہے۔"

"پھر تم آؤ گی؟"

"ہاں ------"

اتنا کہہ کر شانتا تیزی سے پل اتر گئی میں وہیں کھڑا رہا اور وہ میرے دیکھتے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی سامنے والے مکان میں غائب ہو گئی۔ آہ! شانتا کوہلی! چھوٹی سی پیاری سی ہتھنی! رام رام بھٹ جی -----!!

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

8

حسو ڈرائیور کسی زمیندار کے لونڈے کو پہلے پھسلا کر اور پھر چاقو دکھا کر ڈیرے کی چھت پر لے گیا۔ لڑکے نے شور مچا دیا۔ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ حسو بھاگنے لگا۔ لوگوں نے اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا۔ زمیندار دو نالی بندوق لے کر ڈیرے کے باہر آن کھڑا ہوا اور تمام ڈرائیوروں کو ڈھیر کر دینے کی دھمکیاں دینے لگا۔ اگر موقع پر سردار خاں آ کر زمیندار سے معافی نہ مانگتا تو وہاں گولی چل جاتی اور ایک آدھ کا خون ہو جاتا۔ دو روز بعد ڈرائیور حسو کی ضمانت ہوئی اور باہر نکل آیا۔ سردار خاں نے مل ملا کر معاملہ رفع دفع کروا دیا۔ اور حسو ڈرائیور کو اسی روز ٹکٹ خرید کے واپس امرتسر بھیج دیا۔

اس کی جگہ اکا نامی ناٹے قد کا گٹھے ہوئے بدن والا بھالو نما ڈرائیور آیا۔ اس نے ڈیرے میں آتے ہی اعلان کر دیا کہ اگر کسی رات کوئی عورت ڈیرے پر لے آیا تو کسی کو اعتراض نہ ہونا چاہیئے۔ رتا لنگڑ بولا۔

''بھاجی عورت کیسی ہوگی۔''

''لیلا چٹنس ہو یا نہ ہو پر موٹی ضرور ہو گی۔ میں تو موٹی عورت کو ملائی سمجھ کر قلچے کے ساتھ کھا جاتا ہوں۔''

اکا موٹی عورتوں کا متوالا تھا۔ ایسی عورتوں کے ذکر پر اس کی زبان سے چٹخارے کی آواز نکلتی منہ پر چیچک کے داغ تھے اور آنکھوں میں عیاری جھلکتی تھی۔ اپنی شراب کو پانی اور دوسرے کی شراب کو شیر مادر سمجھ کر غٹا غٹ چڑھا جاتا۔ شریف عورتوں کا بڑا احترام کرتا ہے۔

''میں ان آدمیوں کو جان سے مار دوں جو دوسروں کی شریف بیٹیوں کو بری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ارے حرام زادو! دنیا میں بدمعاش عورتوں کی کمی نہیں ہے۔

یوسی پہلے سے اس کی خوب سیٹی مل گئی دونوں رات کو مل کر شراب پیتے اور مل کر رنڈیوں کے ہاں مجرا دیکھنے جاتے۔ اگے نے یوسی کو خبردار کر دیا تھا کہ وہ شراب پی کر بیویوں کو گالیاں مت دیا کرے۔

"تم سسر کی چاہے ناک کاٹ کے رکھدو۔ مگر بیوی کو کچھ نہ کہا کرو۔"

ارے بھوندو! بیوی تو بچوں کی ماں ہوتی ہے ماں۔ کیا ہماری ماں ہمارے باپ کی بیوی نہیں۔ اگر ہمارے باپ بیوی کو تنگ کرے تو کیا ہم اسے برداشت کرلیں گے؟ خدا کی قسم میں لٹھ لے کے باپ کے سامنے کھڑا ہو جاؤں۔"

ان دونوں کی شراب کی محفل میں خوب دھما چوکڑی مچتی۔ اکا یوں تو شرابی اور زانی تھا۔ لیکن اس کو محلے داروں کی شرافت اور آرام کا بڑا خیال تھا۔ وہ شراب پینی شروع کرنے سے پہلے دروازے کھڑکیاں اچھی طرح بند کرتا۔ جب اسے اطمینان ہو جاتا کہ اس کی آواز کوٹھڑی سے باہر نہیں جا رہی تو پھر وہ ننگا ڈانس کرنے پر بھی تیار ہو جاتا۔ اس کے مقابلے میں یوسی شراب پی کر باہر نکل کر شور مچانے کا عادی تھا۔ وہ نشے میں دھت ہو کر بار بار دروازے کی طرف لپکتا۔

"چھوڑو مجھے۔ میں اس محلے کے امام سے بدلہ لینا چاہتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ وہ مجھے شرابی اور بدمعاش کہتا ہے۔ چھوڑو مجھے میں بازار میں ڈانس کرنا چاہتا ہوں۔" اکا اسے کمر سے پکڑ کر کھینچ لیا کرتا۔

"اکے۔ سسر کو گالیاں دلوانا بند کرا دیا۔ بیوی کو برا بھلا کہنا تم نے مجھ سے چھڑوا لیا۔ اب بازار میں بھڑکیں مارنا بھی مجھ سے لے رہے ہو! ہم شراب پئیں تو کس کی خاطر پئیں۔ اسے تو بہتر ہے کہ آدمی نمازی پرہیز گار بن جائے۔ چھوڑو مجھے۔ چھوڑ دو مجھے۔" مگر اکا اسے کبھی نہ چھوڑتا۔ بلکہ دو ایک دھپیں بھی رسید کرتا۔ وہ یوسی کے مقابلے میں ڈیل ڈول والا تھا اور ویسے بھی بڑا ہتھ چھٹ اور نڈر تھا۔ تنگ آ کر یوسی پھینا بیٹھ جاتا اور اسے ہی گالیاں دینی شروع کر دیتا۔

مجھے تم جتنی چاہے گالیاں دے لو۔ مگر تمہیں گلی محلے میں اودھم مچانے نہیں دوں گا۔ دیکھو یوسی! آدمی چاہے کتنا ہی برا ہو جائے لیکن اسے اپنے پاس پڑوس والوں کو کبھی تنگ نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمارے پیغمبر ------ یار میں نے کس منہ سے کن کا نام مبارک لے لیا۔ خدا میرے گناہ معاف کرے۔ میں تو اب اس قابل نہیں رہا کہ ان کا نام مبارک ہی زبان پر لا سکوں ------"

اکا ڈرائیور شادی شدہ تھا اور بیوی بچوں سے بڑا پیار کرتا تھا اوپر کی ساری کمائی وہ

شراب اور رنڈیوں کی نذر کر دیتا اور تنخواہ پوری کی پوری بیوی کے نام منی آرڈر کر دیا کرتا۔ اس نے اپنی ماں کو اپنی خراب عادتوں کی وجہ سے کافی دکھ دیا تھا اور وہ انہی کے دکھ کی وجہ سے مر گئی تھی۔ اکے کو اس جرم کا بے حد احساس تھا۔ چنانچہ وہ شراب پی کر کبھی کبھی رونے لگتا اور ماں کا نام لے لے کر اس سے معافیاں مانگا کرتا۔ اس وقت وہ بالکل بچہ معلوم ہوتا جو بڑے درد بھرے لہجے میں اپنی ماں کو پکار رہا ہو۔ اپنے کام کا وہ بڑا ماہر تھا۔ اور صرف ایک ہاتھ سے وہ اسی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گاڑی چلا لیتا تھا۔ کوئی گاڑی اس کے آگے نہیں جا سکتی تھی۔ وہ ہر لاری کو پاس کرنا اور اس پر گرد اڑانا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ قصور فیروز پور لائن پر اس نے دو تین حادثے بھی کئے تھے۔ جن میں ایک بار اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ اخبار وہ روزانہ پڑھتا اور راجگورو کے ساتھ اس کی اکثر بحث ہوا کرتی۔ وہ جاپان کا شیدائی تھا اور انگریز کا جانی دشمن۔

"تم دیکھ لینا، جاپانی ایک دن انگریزوں کو کھا جائیں گے۔"

راجگورو چونکہ ذرا سنجیدہ مزاج ڈرائیور تھا اور ویسے بھی اسے دعویٰ تھا کہ وہ تاریخ بھی پڑھتا رہا ہے۔ چنانچہ وہ لمبی ناک سکیڑ کر کہتا۔

"اکا جی! تم نہیں جانتے کہ انگریزوں کی تاریخ کیا کہتی ہے؟"

اکا جھلا کر کہتا۔

"اوئے ان کی ماں کا۔۔۔۔۔۔۔ کیا کہتی ہے ان کی تاریخ؟"

کسی زمانے میں وہ میرٹھ چھاؤنی میں انگریز فوجی کے پاس ملازم تھا۔ ان دنوں کے قصے وہ بڑے مزے لے لے کر سنایا کرتا۔ ان میں کچھ من گھڑت داستانیں بھی تھیں۔ تقریباً ہر قصے میں ایک انگریز عورت ہوتی جس کو اکا اڑا کر لے جاتا۔

"ایک میم صاحب تو مجھ سے ادھار پیسے لیا کرتی۔ میں بھی دیا کرتا کہ لیتی جا۔ ایک دن پائی پائی وصول کروں گا۔ بس پھر موقع ملتے ہی وہیں دبوچ لیتا۔ ان میموں کی چٹنی بنانا تو ہمارا فرض ہے۔ خدا نے کیسی عورتیں ہماری چٹنی کے لئے بنائی ہیں۔ کیوں بھئی خواجہ بینڈ کی؟"

خواجہ ران پر ہاتھ پھیر کر آہ بھرتا اور کہتا

"خلیفہ! ہماری قسمت میں کوئی میم نہیں۔"

"تو کیا میم کی چٹنی چکھے بغیر ہی مر جاؤ گے؟"

"امید تو نہیں کہ میم قابو آئے۔"

"اچھا فکر نہ کرو میرے قابو آ لینے دو۔ میں تجھے بھی ایک ڈبکنی لگوا دوں گا۔"

ایک بار میں چار پانچ ڈرائیوروں کے ساتھ امرتسر سے واپس سرگودھا آ رہا تھا۔ رات کے دو بجے گاڑی لائل پور کے سٹیشن پر رکی۔ ان دنوں جنگ کی وجہ سے چینی بالکل نہیں مل رہی تھی۔ سٹال پر چائے پینے لگے تو اس نے شکر ڈالی۔ خواجہ ہینڈک بولا

"چینی نہیں ہے کیا؟"

"چینی کہاں جی۔"

"تم بلیک کرتے ہو۔"

"بلیک کرنے والا کا منہ کالا کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟"

"میں کوئی فارسی تو نہیں بول رہا۔"

"تو کیا ہم بدمعاش ہیں۔ بلیکیئے ہیں؟"

"آپ کو چائے پینی ہے تو پئیں نہیں تو یہاں سے ہٹ جائیں۔" خواجہ نے غرا کر کہا۔

"تم کیا سارا اسٹیشن بھی آ جائے تو کوئی مائی کا لال مجھے یہاں سے ہلا نہیں سکتا۔"

اگر یوسی پھینا اور اکا بیچ میں نہ پڑتا تو وہاں ضرور دھینگا مشتی شروع ہو جاتی۔ خواجہ ہینڈک کے منہ سے تو جھاگ نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد گاڑی لائل پور کے سٹیشن سے سرگودھا کی جانب روانہ ہوئی۔ پسنجر ٹرین تھی۔ لائن کے آر پار کوارٹروں اور بستیوں کے مکانوں پر اندھیر چھایا ہوا تھا۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ سردی بے حد محسوس ہو رہی تھی۔ کسی بھی مکان کے روشندان میں روشنی نہیں ہو رہی تھی۔ ہم لوگ کمبلوں میں منہ سر لپیٹے پڑے تھے۔ خواجہ ہینڈ کی یوسی پھینے کے زانو پر سر رکھے پڑا تھا۔ یوسی پھینا کھڑکی کے ساتھ لگا سگریٹ پی رہا تھا۔ کمبل میں سے صرف اس کی دو آنکھیں ہی نظر آ رہی تھیں۔ اکا بھی کمبل میں لپٹا سگریٹ پی رہا تھا۔ پھر وہ کلائی پر سے گھڑی اتار کر اسے چابی دینے لگا۔

یوسی پھینے نے شہر کے چپ چاپ بند دروازوں والے مکانوں پر بڑی حسرت سے نظر ڈال کر کہا۔

"بٹ جی!"

"کیا ہے؟"

یوسی نے آہ بھر کر کہا۔

"اس وقت ان مکانوں میں کیسے کیسے لوگ کیسی کیسی عورتوں کے ساتھ لیٹے ہوں گے۔"

اکے نے اسے ایک موٹی سی گالی دے کر کہا۔

"شرم کر بے حیا دیا پترا۔ اگر کوئی تیری بیوی کے متعلق ایسا کہے تو کیا تمہیں اچھا لگے گا؟"

"میں تو اس کی زبان کھینچ لوں خلیفہ۔"

"پھر تو دوسروں کی بیویوں کے بارے میں ایسی باتیں کیوں سوچتا ہے۔"

"یار میں نے تو ایک بات کی ہے اور تم خواہ مخواہ میرے سر پر چڑھ رہے ہو۔"

اکے نے چابی دے کر گھڑی کو کان کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں ناں۔"

"بہت اچھا مہاتما گاندھی جی۔"

سرگودھا پہنچنے پر معلوم ہوا کہ گورنمنٹ کی طرف سے ٹرانسپورٹ محکمے کے تین افسر کام کی پڑتال کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ سردار خاں نے مجھے ساتھ لیا، رجسٹر وغیرہ گاڑی میں رکھے اور ہم اس کوٹھی میں آ گئے جہاں وہ تینوں افسر ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ کوٹھی سول لائن کے علاقے میں تھی۔ صبح کے نو بج رہے تھے۔ کوٹھی کے درختوں اور لان کے پودوں پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ سردی میں ہم دونوں ٹھٹھرتے ہوئے گاڑی سے باہر نکلے اور گھنٹی بجائی۔ نوکر ہمیں اندر لے گیا۔ اندر ایک کمرے میں ہیٹر جل رہا تھا اور دو افسر ریشمی لحافوں میں دبکے پلنگ پر لیٹے لیٹے اخبار پڑھ رہے تھے۔ سردار خان ان سے پہلے مل چکا تھا۔ انہوں نے خندہ پیشانی سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ نوکر اعلیٰ قسم کے چینی کے برتنوں میں چائے لے آیا۔ کمرے کی فضا میں بڑی خوشگوار اور گرم تھی اور بالوں کو لگانے والے بڑھیا قسم کے تیل کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ دونوں افسر جوان اور سرخ و سپید تھے اور ہاتھوں کی جلد بڑی نازک تھی اور ناخن چمک رہے تھے۔ میں نے ڈرائیوروں کے بھدے، چپٹے، گندے اور میل

بھرے ہاتھ ہی دیکھے تھے۔ ان افسروں کے ہاتھوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ انہوں نے کبھی کوئی تنکا بھی توڑ کر دہرا نہیں کیا ہوگا۔ ان کے چہروں پر تازگی اور بشاشت تھی۔ رخساروں پر سرخیاں تھیں اور دانت خوب چمک رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے انگریزی میں بات چیت کر رہے تھے۔ اخبار پھینک کر انہوں نے پانی گرم کر کے شیو بنانی شروع کردی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ سردار خان سے پنجابی میں باتیں کرتے جاتے اور کبھی کبھی اس رجسٹر پر بھی نظر ڈال لیتے جو خان نے ان کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ سردار خاں ان کے ساتھ بڑی لجاجت سے ہمکلام ہے اور کچھ کچھ خوشامد بھی کر رہا ہے۔ پہلے تو گرم کپڑوں کی مختلف قیمتوں، ان کی نایابی انڈوں کی مہنگائی اور مرغیوں کے دستیابی پر باتیں ہوتی رہیں۔

"اجی ہم آپ کو یہاں بڑی صحت مند دیہاتی مرغیاں کھلائیں گے۔ یہاں ہمارے ہوتے ہوئے آپ کو کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوگی۔"

ایک افسر نے چمکیلی قینچی سے بڑی نفاست سے مونچھوں کے بال کترتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"وہ تو ہم جانتے ہیں۔ شکریہ۔"

"دوسری مرغیوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

سردار خان نے بے اختیار قہقہہ مار کر کہا۔

"آپ کی دعا سے ان کی بھی کمی نہیں محسوس ہوگی۔"

یہ دونوں افسر مسلمان تھے۔ تیسرا افسر ہندو اور اس کا نام پال تھا۔ وہ ساتھ والے کمرے میں تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی اندر آگیا۔ سردار خان ایک دم کرسی سے اٹھا اور بڑی گرمجوشی سے ملا۔ یہ ہندو افسر درمیانے قد کا دبلا پتلا سا نوجوان تھا۔ آنکھوں میں نسوانیت کا رس گھلا ہوا تھا۔ چہرے پر نزاکت، کم سخنی، سست روی اور شرافت عیاں تھی۔ زردی مائل رنگت سفید تھی اور ہاتھ بڑے نازک تھے۔ اس نے بڑی دھیمی آواز میں سردار خان سے دو ایک باتیں کیں۔ پھر دوسرے افسروں سے انگریزی میں مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے لگا۔ اس کے دانت بڑے چمکیلے اور ہموار تھے۔ وہ بالکل تیار ہو کر آیا تھا۔ اٹھتے ہوئے بولا۔

"اچھا بھئی ارشد میں جا رہا ہوں، پوسٹ آفس میں ڈاک دیکھنی ہے۔"

"او کے ڈیئر۔"

"گیارہ بجے ریجنل آفس میں ملوں گا۔"

"او کے۔"

پال چلا گیا تو ایک افسر نے سردار خان کو آنکھ مار کر کہا۔

ہم روز اس ہندو کو اسلام کی تبلیغ کرتے ہیں۔ آہستہ آہستہ اس کا رحجان بھی اسلام کی طرف ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے ایک ماہ کے اندر اندر یہ مسلمان ہو جائے گا۔

سردار خان جوان کی ہر بات پر ہاں کہہ رہا تھا بولا۔

"یہ تو آپ بڑا نیک کام کر رہے ہیں۔"

دوسرا افسر پتلون پر برش مارتے ہوئے بولا۔

"کیا کریں خاں جی! کچھ آخرت کے لئے بھی تو کرنا چاہیئے۔

اس کے بعد پھر انہوں نے دیہاتی مرغیوں اور انڈوں کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ پہلا افسر بولا۔

"خان جی بالکل ٹھیک ہے ناں؟"

"حضور آپ چیک کر لیں۔ رجسٹر آپ کے سامنے رکھا ہے۔"

"نہیں نہیں ہمیں آپ پر پورا بھروسہ ہے۔"

چنانچہ رجسٹر بند کر دیا گیا اور باتوں کا رجسٹر کھل گیا۔ مرغیوں کی باتیں دیہاتی عورتوں کی باتیں۔ دونوں افسر کچھ اس فحش اور بے حیا انداز میں عورتوں کا ذکر کر رہے تھے کہ میں نے ایسی باتیں شرابی اور زانی ڈرائیوروں کے منہ سے بھی نہیں سنی تھیں۔ سردار خاں بھی اس ذکر خیر میں برابر شرکت کر رہا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے میں نے کبھی اس کے زبان پر عورت کا نام نہیں سنا تھا۔ ڈرائیوروں کی محفل میں صرف بدمعاش عورتیں ہی آ سکتی تھیں اور وہ لوگ صرف بدمعاش عورتوں کے بارے میں ہی اس قسم کی شہوانی باتیں کرتے تھے۔ لیکن ان افسروں کے گرم اور بیش قیمت اشیاء والے کمرے میں ہر شریف عورت کو رسوا کیا جا رہا تھا۔ اور رنڈی سمجھ کر اس کے کپڑے اتارے جا رہے تھے۔ ڈرائیوروں کی صحت مند بے باک شہوت پرستی کے مقابلے میں ان لوگوں کی گفتگو میں ایک قسم کی بیمار قسم کے ہوس پرستی اور سہمی سہمی سی تحریص تھی۔ مجھے ان کی باتوں سے گھن آنے لگی۔

شام کو یہ لوگ بڑے اعلیٰ قسم کے گرم کپڑوں میں ملبوس ہمارے ڈیرے پر آئے اور ناک سکیڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ ایک افسر بولا۔

"خان جی اتنی گندی جگہ پر یہ لوگ کیسے رہ لیتے ہیں۔"

سردار خان، ہنس کر احمقوں کی طرح بولا۔

"بس جی گزارہ ہی تو کرنا ہے اور پھر ان لوگوں کو گندگی کچھ نہیں کہتی۔"

خواجہ بینڈک بھی دوسرے ڈرائیوروں کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ دھوتی سے ناک صاف کرنے لگا تو سردار خاں نے اسے قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر منع کیا۔ خواجہ بے چارہ چپ چاپ مجبور ہو کر کھڑا رہا اور اس کی ناک میں خارش ہوتی رہی۔ سردار خاں نے اگرچہ دو روز پہلے ہماری کوٹھڑی میں سفیدی کروادی تھی۔ لیکن جن دیواروں پر بارہ برس کی کالک چمٹی ہو ان کا ایک دن کی سفیدی کیا بگاڑ سکتی ہے بلکہ اس سفیدی نے دیواروں کی کالک کو زیادہ نمایاں کر دیا تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کوئی حبشی چہرے پر میدہ مل کر سامنے کھڑا ہے۔ افسر چلے گئے تو ڈرائیور بھی گردنیں جھٹکاتے، ناک کھجاتے، رانوں پر ہاتھ ملتے ادھر ادھر ہو گئے اور کوٹھڑی کی تاریک فضا میں گڈمڈ ہو گئے۔

خواجہ بینڈک نے ناک کو اچھی طرح رگڑ کر پوچھا۔

"یار راجگورو ان لوگوں کو افسر کون بناتا ہے؟"

"افسر اور کون" راجگورو نے کنالی میں آگ ڈالتے ہوئے کہا۔

"تم یہ کنالی کہاں لئے جا رہے ہو؟"

"بستر میں۔"

"کمینے اس میں تو آٹا گوندھا جاتا ہے۔"

"اور میں کیا اس میں نہا رہا ہوں۔"

"راج۔ گورو تمہاری سردی نے ہمارے برتنوں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ تم اپنا علاج کیوں نہیں کرواتے؟"

"سردی کا علاج صرف گرم کپڑے ہیں۔"

"گرم کپڑے لنڈے سے منگوا لو۔"

"وہاں سے بچوں کے کپڑے منگواؤں کہ اپنے۔"

"ہٹ کے بدھو" خواجہ نے نرت کرتے ہوئے کہا۔

گامی بولا۔

"یار خواجہ یہ افسر کوئی ہزار روپے تنخواہ تو ضرور لیتے ہوں گے۔"

راجگورو بولا۔

"ہزار تو نہیں پانچ چھ سو ضرور لیتے ہوں گے۔"

خواجہ ہینڈک بولا۔

"اور پھر ٹی اے لگا، پٹرول مفت، روٹی مفت۔"

"روٹی کہاں مفت خواجہ۔"

"بھئی مفت ہی ہوئی ناں۔ اب یہاں آئے تو سمجھ کر کہ کیا سردار خاں روز ان کی دعوتیں نہیں کرے گا؟"

"اسے تو کرنی ہی پڑیں گی۔"

"بس جی عیش کرتے ہیں یہ لوگ اور ایک ہم ہیں کہ زندگی کی 8362 کو ہینڈل مار مار کر چلا رہے ہیں۔ کیوں بھئی ماموں؟"

مدقوق ڈرائیور بستر میں لیٹنے کی اور رات کو کھانسنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے کمبل جھاڑتے ہوئے کہا۔

"دیکھ لینا خواجہ ایک دن یہ 8362 اپنی نمبر لے جائے گی۔"

"کونسا نمبر۔۔۔؟ دس نمبر؟"

سارے ڈرائیور خچروں کی طرح ہنسنے لگے۔ خواجہ نے نعرہ مار کر کہا۔

"کمبل جھاڑ کر یہاں بھی اپنی بیماری کیوں پھیلاتے ہو؟"

راجگورو نے کہا۔

"خدا کا خوف کرو خواجہ۔"

"اچھا تو پھر یہ کمبل میرے اوپر لا کر دو۔"

اگلے روز تینوں افسر ہوائی اڈے پر بھی پہنچ گئے۔ حسب معمول خوبصورت خوش رنگ ٹائیوں، سویٹروں، جوتوں اور پتلون کوٹ میں ملبوس تھے۔ ہوائی اڈے میں گرد اڑ رہی تھی۔ کار میں سے اتر کر وہاں آئے ناک پر رومال رکھ کر اوور سیر اور ٹھیکیدار سے کچھ باتیں

محمد طارق اقبال

کیں۔ مزدور عورتوں کو آنکھ بھر کر دیکھا اور ناک پر رومال رکھے رکھے جلدی سے کار میں بیٹھ کر واپس چلے گئے۔ راستے میں ایک افسر نے دوسرے افسر سے کہا۔

''وہ لڑکی دیکھی تم نے؟''

''کونسی؟''

''وہی کالے گھنگرے والی۔''

''کالی آنکھوں والی۔''

''ہاں ہاں وہی۔''

''پٹاخہ ہے پٹاخہ۔''

''پھر چلا جائے کیا؟''

''ہونا تو یہی چاہیئے۔''

''فکر نہ کرو۔''

کالی کار شہر کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ ریڑوں، اونٹوں کی قطاروں اور کھیتوں میں کام کرتے افلاس زدہ کاشتکاروں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی۔ ان پر ہزاروں سالوں کی گرد ڈالتی ہوئی۔ اس کار میں بیٹھے ہوئے لوگ سوچ رہے تھے کہ کسی طرح رات کو اس کالی کالی آنکھوں والی مزدور لڑکی کو کوٹھی بلا لیا جائے اور کار سے باہر لکڑیوں سے لدے ہوئے اونٹ کی مہار پکڑ کر شہر کی طرف جانے والا سوچ رہا تھا کہ لکڑیاں بک جائیں تو وہ دو وقت کا آٹا خرید لے۔ کالی آنکھوں اور آٹے کے کنستر کے درمیان کتنا طویل اور ناقابل عبور فاصلہ حائل ہے!

9

آخر شائستہ کوہلی ایک روز میرے قابو آ گئی۔

اس نے میری خاطر گھر میں بہانہ بنایا کہ وہ اپنی ایک سہیلی کے ہاں اس کی سالگرہ پر جا رہی ہے اور شام کو واپس آئے گی۔ وہ تین بجے دوپہر مجھے ملی اور میں اسے لے کر سیدھا شہر کے سینما گھر میں لے آیا۔ غالباً یہ اکلوتا سینما گھر تھا اس کی چھت پر اندر کبوتر بیٹھے تھے اور فرش پر تماش بین۔ یہ کبوتر ان تماش بینوں کے سروں پر بیٹیں کرتے رہتے کوئی ہوش ربا منظر سکرین پر آتا تو یہ کبوتر پیشاب بھی کر دیتے۔ تھرڈ کلاس میں دریاں بچھی تھیں۔ سیکنڈ کلاس میں چارپائیاں بچھی تھیں اور فسٹ کلاس میں ٹین کی ٹھنڈی کرسیاں پڑی تھیں۔ باکس واقعی باکس یعنی صندوق تھا۔ اندر بید کی بغیر بازوؤں کے چار کرسیاں پڑی تھیں۔ جگہ اتنی تنگ تھی کہ اندر جانے اور پھر باہر نکلنے کے لئے پہلے چاروں کرسیوں کو ہٹانا پڑتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ لڑائی مار کٹائی کی یا کوئی محبت کے مناظر سے بھرپور فلم لگی ہو گی۔ لیکن اس اعتبار سے بھی اس سینما گھر نے مایوس کیا۔ یہاں فلم "بھگت کبیر" چل رہی تھی۔ بھارت بھوشن، مظہر خاں اور مہتاب نے کام کیا تھا۔ شائستہ نے کچھ حلیہ بدل رکھا تھا اور اس نے اپنا سویٹر سہیلی کے گھر چھوڑ دیا اور اس کی کالی شال اوڑھ رکھی تھی۔ باکس میں سردی تھی اور ٹھنڈ ہو رہی تھی۔ شائستہ نے ایک جھرجھری لی اس کے دانت بجنے لگے۔

"سردی ہے۔"

"ہاں۔"

"فلم کونسی لگی ہے؟"

"بھگت کبیر۔"

"مزا آ جائے گا۔"

"تباہ ہو جاؤں گا۔" میں نے دل میں کہا۔ اوپر سے کہا۔

"کرشن جی کے بعد مجھے صرف بھگت کبیر نے ہی متاثر کیا ہے۔ بڑا جینئس آدمی تھا۔ درزی کی چھوٹی سی دکان ہوا کرتی تھی اس کی بنارس میں۔ کہاں اتنی ترقی کر گیا کہ دکان

چھوڑ کر فقیر ہو گیا اور ہر چوک میں کھڑا ہو کر رونے لگا۔ کہتے ہیں۔ اس نے چلتی چکیاں بند کرادی تھیں۔"

"وہ کیسے جی؟" شانتا نے حیرانی سے پوچھا۔

"کبیر صاحب کی یہ عادت تھی کہ جہاں چلتی چکی دیکھتے وہیں رونا شروع کر دیتے۔ آخر شہر کے لوگ عاجز آگئے اور انہوں نے ایکا کر کے چکیاں ہی بند کر دیں۔"

"بڑمی کرنی والے رشی تھے۔"

"کہتے ہیں انہوں نے بچے بہت پیدا کئے تھے۔"

"سارے کے سارے بچے بھگت ہو گئے تھے۔"

میں شانتا کو راہ راست پر لا رہا تھا۔ اور وہ بار بار اس سے بھٹک رہی تھی۔ سٹیج پر ایک آدمی نے لا کر گراموفون رکھ دیا اور ریکارڈ بجانے لگا۔

"اکھیاں ملا کے جیا بھرما کے چلے نہیں جانا
ہو ہو چلے نہیں جانا۔"

یہ سینما ہال کی ریکارڈنگ تھی۔ تھرڈ کلاس والے دریوں پر ٹولیوں کی صورت میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور اپنے بیلوں اور ڈنگروں کی بیماریوں کی بابت باتیں کر رہے تھے۔ سیکنڈ کلاس والے چارپائیوں پر کمبلوں اور لحافوں میں لپٹے پڑے تھے۔ جنہیں وہ ساتھ لائے تھے۔ ہال کی چھت ایک جگہ سے پھٹی ہوئی تھی اور یہاں سے آسمان صاف دکھائی دے رہا تھا۔ خدا خدا کر کے سٹیج پر ریکارڈ بجانے والے نے گراموفون کا دھوتو اتار کر بغل میں دبایا مشین اٹھا کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ایک آدمی نے آ کر گھنٹی بجا کر اعلان کیا۔

"بھائیو! اب فلم شروع ہوتی ہے۔"

اس اعلان کے بعد اس شخص نے سٹیج پر کھڑے ہاتھ ہلا کر آواز دی۔

"صمدو! شروع کر دے اوئے۔"

اپریٹر نے آواز سن کر ہال کی بتیاں گل کر دیں اور مشین چلا دی۔ اور فلم شروع ہو گئی

اگرچہ کاپی نئی تھی مگر مشین پرانی تھی۔ اس کی کھڑ کھڑ کی آواز ہمیں باکس میں صاف سنائی دے رہی تھی۔ لیکن مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ہال میں بتیوں کے گل ہو

جانے سے اندھیر ہو گیا۔ میں نے شانتا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ شانتا نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اس وقت بھگت کبیر فلم پر ایک چھوٹا سا بچہ تھا۔ میں شانتا کے ہاتھ کو تھام کر اسے چومتا رہا۔ پیار کرتا رہا اور شانتا کو اپنی محبت کا یقین دلاتا رہا۔ شانتا نے کوئی اعتراض نہ کیا اور میری باتوں کو سنتی رہی اور فلم دیکھتی رہی۔

میں نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے اپنا ایک بازو شانتا کے کندھے کے گرد پھیلا دیا۔ شانتا ذرا سکڑ گئی۔ اس وقت بھگت کبیر اپنی بیوی کو کہہ رہا تھا کہ وہ بھگوان کی محبت میں سب کچھ لٹا دینا چاہتا ہے۔ میں شانتا کے گول گول شانوں اور گردن پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتا رہا اور مزے لیتا رہا۔ میری آنکھیں پردہ سیمیں پر تھیں لیکن مجھے دکھائی کچھ نہیں دے رہا تھا۔

میں نے دوسرا قدم بھی آگے بڑھانا چاہا تو شانتا نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

"بھگوان کے لئے کیا کرتے ہیں آپ؟"

میں نے سامنے دیکھا تو وہاں بھگت کبیر ایک مندر کے باہر کھڑا آنسو بھری آنکھوں سے بھگوان کی مورتی کو دیکھ رہا تھا۔ بھگت کبیر میرا جانی دشمن بن کر میرے رنگ میں بھنگ ڈال رہا تھا۔ یہ آج اس فلم کو ہی چلنا تھا۔ کیا ان کمینوں نے یہ فلم صرف اس دن کے لئے ہی منگوائی تھی۔ اچانک فلم ٹوٹ گئی۔ بھگت کبیر اپنے باپ سے باتیں کر رہا تھا کہ کٹک کی آواز پیدا ہوئی اور فلم ٹوٹ گئی۔ ہال میں بتیاں روشن ہو گئیں۔ میں نے شانتا کی گردن سے بازو باہر کھینچ لیا۔ ہال میں لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ اچانک وہی گھنٹی والا آدمی گھنٹی بجاتا سٹیج پر نمودار ہوا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔

"بھائیو! فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔ ہماری فلم ٹوٹ گئی ہے۔ کمپنی نے مال خراب بھیجا تھا۔ اس میں سینما والوں کا کوئی قصور نہیں۔ ابھی فلم جڑ جاتی ہے۔ خاموش رہو۔ ٹن ٹن ٹن ۔۔۔۔۔"

بتیاں پھر گل ہو گئیں اور فلم شروع ہو گئی۔

ادھر میں نے بھی اپنی فلم شروع کر دی۔ لیکن شانتا پر فلم کا پورا اثر پڑ رہا تھا۔ اس کے ذہن پر بھگت کبیر چھایا ہوا تھا۔ میں نے کہنا شروع کر دیا۔

"یہ بھارت بھوشن بڑا بدمعاش آدمی ہے۔ کہتے ہیں سارا سارا دن بمبئی میں لڑکیوں

کے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔"

شانتا نے کہا۔

"نہیں نہیں یہ تو بھگت کبیر جی ہیں۔ ایسا نہیں کرسکتے۔ یہ تو بھگوان کے اوتار ہیں ۔"

میں چاہتا تھا کہ شانت کے ذہن پر سے بھگت کبیر کا اثر زائل ہو اور وہ بھارت بھوشن کو سامنے رکھے لیکن شانتا اس مٹی سے ہی نہیں بنی تھی جو اس کے سمجھ میں میری بات آجاتی ۔ مجھے یہ فکر کھائے جا رہا تھا کہ ایسا سنہری موقع بار بار ہاتھ نہیں آیا کرتا۔ مگر میں کیا کرتا۔ شانتا ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی۔ چور کی طرح بھاگی جا رہی تھی اور اس بھاگتے چور کی لنگوٹی بھی میرے ہاتھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر کوشش کی لیکن شانت نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ ادھر وہ کمینہ بھارت بھوشن بھگت کبیر کا روپ دھارے ایک چوک میں کھڑا رہا تھا۔ چلتی چکی پر یا میری قسمت پر ۔۔۔۔ ! میری ہر کوشش کو یہ ماں کا بناوٹی بھگت کبیر ناکام بنا رہا تھا ۔ مجھے یقین ہے اگر وہاں "بھگت کبیر کی بجائے سلوچنا کی "بمبئی کی بلی" فلم چل رہی ہوتی تو اس وقت تک شانتا میری آغوش میں بھیگی بلی بن دبکی بیٹھی ہوتی۔ لیکن فلم ایک بار پھر ٹوٹ گئی۔

لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ گھنٹی والا آدمی ہاتھ میں گھنٹی ہلاتا اور گردن پر ٹکی ہوئی کھوپڑی ہلاتا سٹیج پر آیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا۔

"بھائیو! انٹرول ہو گیا ہے۔"

اور اسی طرح گھنٹی اور سر ہلاتا واپس چلا گیا۔ تھرڈ کلاس والوں نے وہیں چلم کے لئے آگ جلانی شروع کر دی اور پوٹلیاں کھول کر روٹی کھانے لگے۔ سیکنڈ کلاس والے اٹھ کر چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ (کیونکہ وہ لیٹ کر فلم دیکھ رہے تھے) جو سو گئے تھے وہ پڑے خراٹے لیتے رہے۔ فسٹ کلاس والوں نے اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلنا شروع کر دیا کیونکہ لوہے کی ٹھنڈی کرسیوں پر بیٹھے بیٹھے ان کی ٹانگیں برف ہو کر سن ہو گئی تھیں۔ چھت کے اندر بانس کے ڈنڈوں پر بیٹھے ہوئے کبوتروں نے بھی انٹرول کا سن کر لوگوں کے سروں پر دھڑا دھڑ بیٹیں اور پیشاب کرنا شروع کر دیا۔ میں باہر جا کر شانتا کے لئے کیلے لے آیا۔ ہم دونوں بیٹھ کر کیلے کھانے لگے۔ شانتا دیکھتے ہی کیلے اوپر تلے کھا گئی میرے ہاتھ ابھی دوسرا ہی کیلا تھا۔ میرا اور

اس کیلے رنگ اڑ گیا۔ میں نے مذاق سے پوچھا۔

''اور کیلے کھاؤ گی شانتا؟''

شانتا نے شرما کر کہا۔

''لے آیئے۔ چھتری والے لایئے چھتری والے۔''

اس وقت میں خود چھتری والا کیلا بن کر نکل گیا۔ جیب میں سے ٹٹول کر پیسے نکالے اور شانتا کے لئے مزید چھ کیلے لے کر اندر آ گیا۔ شانتا نے چار کیلے اس میں سے کھا لئے اور اگر میں دو کیلے پہلے اپنے ہاتھ میں نہ لے لیتا تو وہ انہیں بھی ہڑپ کر جاتی۔ میں نے ان کیلوں کو ہاتھ میں ہی پکڑے رکھا۔ اتنے میں وہی گھنٹی والا آدمی گھنٹی اور کھوپڑی ہلاتا سٹیج پر نمودار ہوا۔

''بھائیو! تیار ہو جاؤ۔ فلم شروع ہونے لگی ہے۔ ریڈی! ون! ٹو! تھری!''

اس نے آپریٹر کو زور سے آواز دے کے مشین چلانے کو کہا۔ اور خود گھنٹی بجاتا کھوپڑی ہلاتا باہر نکل گیا۔ بتیاں بجھ گئیں اور فلم شروع ہو گئی۔ شانتا نے ایک بار پھر بڑے انہماک سے فلم دیکھنی شروع کر دی۔ میرے ایک ہاتھ میں دونوں کیلے تھے اور میں دوسرے ہاتھ سے شانت کے سیب ٹٹول رہا تھا۔ شانتا نے میرا ہاتھ پرے ہٹا کر کہا۔

''ہائے بھگوان! بھگت کبیر جی کو لوگ کس طرح پتھر مار رہے ہیں؟''

اس وقت پردہ سیمیں پر بھگت کبیر یا بھارت بھوشن کو لوگ پتھروں کا نشانہ بنا رہے تھے اور بھگت کبیر اپنی ستم رانیوں کا مجھے نشانہ بنا رہا تھا۔ سکرین پر نظریں گاڑے شانتا نے ایک ہاتھ میرے کیلوں والے ہاتھ کی طرف بڑھا دیا۔ میرے ہاتھ اور کیلے کانپنے لگے۔ مگر شانتا ایک کیلا اٹھا کر لے گی اور بھگت کبیر کی حالت زار پر آنسو بہاتے ہوئے چھتری والا کیلا چھیل کر کھانے لگی۔

آخری بار جب فلم ٹوٹی تو گھنٹی والے نے سٹیج پر آ کر اعلان کیا۔

''بھائیو! کھیل ختم ہوتا ہے۔''

لوگوں نے دریوں، چارپائیوں اور ٹھنڈی کرسیوں سے اٹھ کر خوشی کے نعرے لگائے اور کمبل، لحاف اور حقے سنبھال کر جمائیاں لیتے ہوئے باہر نکلنا شروع ہو گئے۔ میں اور شانتا بھی کرسیوں اور کیلے کے چھلکوں کے ڈھیر پر سے اٹھے اور باکس یعنی صندوق سے باہر آ گئے۔ باہر شام ہو چکی تھی۔

"ہائے بھٹ جی بڑی دیر ہو گئی۔"

"یہ اپنے بھگت کبیر سے پوچھو۔"

"دھرم سے تو میرا دل بھر آیا۔ میں تو روتی رہی تھی۔"

"ہاں میں جانتا ہوں۔ میں تمہیں روتے اور کیلے کھاتے ہوئے دیکھتا رہا ہوں۔"

"ارے! بھٹ جی میں نے کیلے بھی کھائے تھے کیا؟"

میں کلیجہ اور اپنی جیب مسوس کر رہ گیا۔

اس روز تو میں اس بھگت کبیر کی بھگتنی شانتا کو کچھ نہ کہہ سکا اسے کیلے کھلاتا رہا اور خود اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ لیکن ایک روز بعد میں نے اسے کیول سیٹھی کی دکان کی پچھلی کوٹھڑی میں پکڑ لیا اور سالے کیلے نکلوا لئے اور بھگت کبیر کے ایک ایک بھجن کا انتقام لیا اور ایک ایک دوہے کو بار بار دوہا۔ شانتا شور مچاتی رہی۔ کبھی بھگت کبیر کا نام لے کر، کبھی کرشن جی مہاراج کا نام لے کر لیکن میں اللہ کا نام لے کر اپنے سارے کیلے نکالتا رہا۔ غریب آدمی ہوں۔ کسی کو ایک کیلا نہیں کھلا سکتا۔ کہاں یہ شانتی تھی کہ پورے درجن بھر کیلے کھا گئی تھی۔ کیول سیٹھی باہر دکان کا حساب کتاب کرتا رہا اور میں اندر کیلوں کا حساب کتاب کرتا رہا۔ جب سارا حساب برابر ہو گیا تو شانتا نے منہ بسور کر کہا۔

"ہائے بھٹ جی آپ تو راکھشش ہیں۔"

"ہاں شانتا میں راکھشش ہوں۔ راون ہوں۔ میرے بارہ ہاتھ ہیں۔ باہر گردنیں ہیں، بارہ سر ہیں اور بارہ منہ ہیں۔"

"ہائے رام میں مر گئی۔ میں تو آپ سے کبھی نہیں ملوں گی۔"

"کل پھر بھگت کبیر فلم دیکھنے چلیں گے۔"

"اب تو میں کبھی نہیں جاؤں گی۔"

"کبھی نہیں۔"

"کیوں اپنا دھرم تازہ نہیں کرو گی؟"

"کیلے نہیں کھاؤ گی۔"

"کبھی نہیں۔"

"زندہ باد شانتا۔"

میں شانتا سے لپٹ گیا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اور بھرا بھر جسم ابھی تک گرم تھا۔ وہ اپنے فراخ نتھنیوں میں سے زور زور سے سانس لے رہی تھی۔ اس کی بندیا کوٹھڑی میں کہیں گر پڑی تھی۔ میں نے باہر نکل کر کیول سیٹھی سے ایک نئی بندیا لے کر اس کے ماتھے پر لگا دی۔ جب وہ چلی گئی تو کیول نے مسکرا کر کہا۔

"تم واقعی بڑے ظالم ہو"

"کیوں؟"

"بس تم خود ہی سمجھ لو"

میں نے سگریٹ سلگا کر کہا۔

کیول! عورت بربریت کو پسند کرتی ہے، محبت اس کی اور نفرت اس کے جسم کی خوراک ہے دونوں سے کوئی بھی نہ ملے تو وہ مرجھا جاتی ہے۔ عورت ان دونوں جذبوں کے سنگم کا نام ہے۔ یہ دونوں ہی جذبے اس کے لئے بڑے ضروری ہیں۔

اس کے بعد کیول نے چائے منگوائی اور ہم دونوں دیر تک بیٹھے چائے پیتے رہے اور ایک دوسرے سے شانتا اور دوسری عورتوں کی باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد میں نے شانتا سے ملنے کی کوشش کی مگر وہ میری صورت ہی سے گریزاں تھی۔ دور سے مسکرا کر دیکھ لیتی لیکن نزدیک بالکل نہیں آتی۔ اور مجھے تو نزدیک والی عورت کی ضرورت تھی۔ اگر دور ہی سے عشق کرنا ہے تو پھر آدمی خدا سے عشق کرے جو دوری کی انتہا ہے۔

میں ہر روز صبح پٹرول پمپ پر کھڑا ہو کر لاریوں میں پٹرول ڈلواتا تھا۔ اس کے سامنے ایک دو منزلہ مکان تھا۔ نیچے ایک کباڑیئے کی طویلہ نما دکان تھی۔ دسری منزل کی کھڑکیوں پر چقیں گری رہتیں۔ جس وقت میں پٹرول پمپ پر آ کر کھڑا ہوتا اس مکان کی ایک چق اٹھتی اور ایک دبلی پتلی نازک سی گوری گوری تیکھے نقشے والی لڑکی پہلے باہر جھانک کر دیکھتی۔ پھر مجھ سے آنکھیں چار کرتی اور پھر چق گرا کر واپس ہو جاتی۔ اس کے بعد تھوڑی دیر کے وقفے سے چق ہلتی رہتی۔ پھر ایک چوڑیوں والا گورا گورا ہاتھ باہر نکلتا اور سر کے بالوں کی گچھی سی باہر پھینک دیتا۔

کسی وقت یہ لڑکی چق اٹھا کر باندھ دیتی۔ اب میں اسے کھڑکی کے اندر کمرے میں صاف دیکھتا۔ کبھی وہ گلابی سویٹر میں ہوتی اور کبھی محض آسمانی قمیض پہن رکھی ہوتی۔ وہ

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

محمد طارق اقبال
پاکستانی ریڈائٹ
ڈاٹ کام

میں گرفتار ہو جاؤ۔ زمانہ بڑا خراب جا رہا ہے۔"

"فکر نہ کرو کیول! میں بھی بڑا خراب جا رہا ہوں۔"

اس روز میں پٹرول پمپ پر جتنی دیر بیٹھا رہا خورشید یا کرشید کھڑکی میں آئینے کی سامنے کھڑی کبھی بال بناتی رہی اور کبھی میری طرف دیکھ کر مسکراتی رہی ----۔ آج وہ بڑی خوش خوش نظر آ رہی تھی اور اس نے سر دھو کر کپڑے بھی نئے پہنے ہوئے تھے۔ میری حجامت بنی ہوئی تھی (یا رات کو سیڑھیوں پر بننے والی تھی) اور میں نے بھی نئے کپڑے پہن رکھے تھے ---۔ سارا دن میں یا تو ہوٹل میں چائے پیتا رہا اور یا کیول کی دکان پر بیٹھا اس کے ساتھ رات کو ہونے والی ملاقات پر باتیں کرتا رہا۔ آٹھ بجے کیول دکان بند کر کے چلا گیا اور میں ہوٹل میں کھانا کھانے آ گیا۔ نو بجے تک تو ہوٹل میں بیٹھا رہا۔ یہاں سے اٹھ کر ڈیرے آ گیا۔ ساڑھے دس بجے تک اپنے بچھونے پر لیٹا راجگورو سے مانگا ہوا رسالہ پڑھتا رہا۔ پورے گیارہ بجے جب ڈرائیور سو گئے۔

میں آہستہ سے اٹھا۔ قمیض کے اوپر سویٹر پہنا ---۔ گرم شال اوڑھی اور کیواڑ کھول کر چپکے سے کوٹھڑی سے نکل گیا۔

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

10

باہر رات بڑی سرد تھی۔

میدان میں ایک مریل سا کتا بڑی نقاہت سے بھونک رہا تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ سڑک دور تک خالی تھی۔ آسمان پر نیلے نیلے ستاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ہڈیوں کو جما دینے والی ہوا چل رہی تھی۔ میں گرم شال کو بدن کے گرد اچھی طرح لپیٹے پمپ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ مکان میں میز کے پاس ٹیبل لیمپ جل رہا تھا۔ میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ جب میں مکان کے دروازے کی طرف بڑھا تو حوصلہ جواب دینے لگا۔ کہیں اس عورت نے مجھے ذبح کرنے کا پروگرام تو نہیں بنا رکھا؟ اگر کہیں اس ادھیڑ عمر کے گنجے آدمی کو معلوم ہو گیا تو صبح یہ خادم حوالات میں ہو گا اور کرشید بڑے مزے سے آئینے کے سامنے کھڑی بال بنا رہی ہو گی۔ میں چپکے سے مکان کے دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں نے ایک انگلی سے دروازے کو آہستہ سے دبایا تو وہ کھل گیا۔ اب میرے اور کرشید کے درمیان عزت اور بے عزتی زندگی اور موت کے درمیان ایک دہلیز کا ہی فاصلہ تھا۔ اتنی بڑی خلیج ایک بے حقیقت دہلیز بن کر سکڑ گئی تھی۔ میں نے خدا کا نام لیا اور دروازہ کھول کر ڈیوڑھی میں آ گیا۔ میں نے دروازہ بند کر دیا۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی کسی نے اندھیری سیڑھیوں پر ماچس جلائی۔ ماچس کی روشنی میں میں نے اوپر والے دروازے کے پاس کرشید کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ اس کے ناک کا سایہ اس کے ماتھے پر اور ماتھے کا سایہ پیچھے دیوار پر پڑ رہا تھا۔ اس وقت وہ کوئی چڑیل معلوم ہو رہی تھی۔ میں ڈر کر پیچھے بھاگنے ہی والا تھا کہ کرشید نے آواز دی۔

"آ جاؤ۔ اوپر آ جاؤ۔"

چلے جاؤ سور داس! اوپر چڑیل بلا رہی ہے۔ تمہاری موت بلا رہی ہے۔ چلو اوپر چلو اور جا کر ذبح ہو جاؤ۔ اب تمہیں کوئی نہیں بچا سکتا۔ میں اوپر چڑھ گیا۔ کرشید مجھے کمرے میں لے گئی۔ جہاں ٹیبل لیمپ جل رہا تھا۔ اس نے فوراً کھڑکی بند کر دی اور ٹیبل لیمپ بجھا کے مٹی کے تیل کا ہلکی روشنی والا لیمپ جلا دیا۔

کمرہ گرم ہو رہا تھا۔ کیونکہ کرشید نے انگیٹھی میں کوئلے جلا کر رکھے ہوئے تھے۔ کمرہ مختصر تھا۔ دیوار سے پلنگ لگا تھا۔ دو آرام کرسیاں پڑی تھیں۔ کارنس پر آئینہ پڑا تھا۔ ایک طرف صندوق رکھے تھے۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ پرچھتی پر تانبے کے برتن لگے تھے لیمپ کی روشنی ہلکی تھی جس میں کرشید کا رنگ بادامی معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے بھی گرم چادر اوڑھ رکھی تھی ناک میں فیروزی کیل تھا۔ میں نے کمرے میں جاتے ہی اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور ہونٹ چوم لئے۔

کرشید نے مجھے آہستہ سے پرے ہٹا کر کہا۔

"بڑے بے صبر ہو؟"

"کیا کروں کرشید۔ جب سے تمہیں دیکھا ہے بے صبر ہو رہا ہوں۔"

"جھوٹ بالکل جھوٹ۔۔۔۔ بلایا تو میں نے پہلے تھا تمہیں۔"

"میں تو اس لئے بھی نہیں بلا رہا تھا کہ کہیں تم ناراض نہ ہو جاؤ جب تمہارا خط ملا تو میں شیر ہو گیا۔"

"آؤ پلنگ پر بیٹھ جاتے ہیں۔ آج کتنی سردی ہے!"

"میری تو باہر قلفی جم گئی تھی۔"

کرشید آہستہ سے ہنس پڑی۔ میں نے قریب سے دیکھا۔ کرشید لڑکی نہیں تھی۔ بلکہ کچھ عورت ہو چکی تھی۔ ناک کے آس پاس دو بڑی لکیریں تھیں۔ جو ہنستے وقت نمایاں ہو جاتیں۔ جسم اگرچہ دبلا تھا مگر چھاتیاں صحت مند تھیں اور اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ کولھوں پر بھی کافی چربی تھی۔ اس کی آنکھیں چھوٹی تھیں اور ناک ضرورت سے زیادہ پتلی اور تیکھی تھی۔ پنجابی کا لہجہ ٹھیٹھ تھا وہ اس لئے کہ وہ گجرات کی رہنے والی ان پڑھ عورت تھی۔

وہ پلنگ پر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور لحاف اس نے اپنے گھٹنوں پر کر لیا میں بھی جوتے اتار کر اس کے پاس ہو کر لحاف میں گھس گیا۔ میں نے کرشید کی بغل میں ہاتھ ڈال کر پوچھا۔

"تمہارے ابا جی آج گھر پر نہیں کیا؟"

"کون ابا جی؟"

"وہی گنجے سے سر والے

کرشید ہنس پڑی اور بولی۔

''وہ تو میرا خاوند ہے۔''

''خاوند؟''

''ہاں۔ بڑا کھوسٹ آدمی ہے۔ میں تو اس کی شکل سے بیزار ہوں۔''

''ٹھیک ہے مگر وہ کھوسٹ ہے کہاں۔ کیونکہ اس وقت مجھے پکڑوانے کے لئے وہ کھوسٹ بھی بہت تھا۔

''فکر نہ کرو۔ وہ ہر منگل کو سلانوالی چل جاتا ہے اور اگلے روز دس بجے واپس آتا ہے۔''

''اور اگر کہیں وہ آج ہی رات کو آ گیا؟''

''اس سردی میں باہر نکل کر اسے مرنا ہے کیا؟''

''اگر تمہیں پسند نہیں تو تم نے شادی کیوں کی؟''

''میری شادی تو میرے چچا نے کر دی۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ چچا پر میں بوجھ بن گئی تھی، اس نے اس گنجے سے مجھے بیاہ دیا۔ کم بخت پہلے دو بیویوں کو قبرستان پہنچا چکا ہے۔''

''کیا وہ تم سے محبت نہیں کرتا؟''

''وہ تو مجھے اپنی رانی کہا کرتا ہے۔ لیکن میں تو اس کی ذرا پروا نہیں کرتی۔ ایسا گندہ آدمی ہے کہ کیا بتاؤں۔ بس کہتا ہے کہ ساتھ لگ کر لیٹی رہو اور کچھ نہ کرو۔ بھلا ایک ادھیڑ عمر آدمی سے مجھ ایسی جوان عورت کو کیا لگاؤ ہو سکتا ہے اور پھر جبکہ خاوند پورا مرد بھی نہ رہا ہو۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو''۔۔۔۔۔

کیا تم ڈر رہے ہو؟''

''کون میں؟''

''ہاں تم!''

''اجی کیسی باتیں کرتی ہو۔ عشق کرنے والوں کے دل بے خوف ہوتے ہیں۔''

''تمہارے ڈرائیور بڑے برے ہیں۔ جتنی دیر پٹرول پمپ پر رہتے ہیں بس میری کھڑکی کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔''

''کرشید!'' تو کیا میں کوئی ایسی ویسی عورت ہوں۔ یہ تو من کی مرضی کا سودا ہوتا ہے۔ اور پھر یہ بدمعاش تو اشارے بھی کرتے رہتے ہیں۔ خدا کی قسم اگر تم وہاں کھڑے نہ ہو تو یہ

کھڑکی ہمیشہ بند رکھوں،

"فکر نہ کرو۔ میں ان سب حرام زادوں کی طبیعتیں ٹھیک کر دوں گا۔"

"نہ نہ تم انہیں کچھ نہ کہنا۔"

"کیوں۔"

"تم میری خاطر لڑائی کیوں مول لو؟"

"کرشید! میں تو تمہاری خاطر سارے سرگودھا شہر سے لڑائی مول لے سکتا ہوں۔ اس پٹرول پمپ کو بم مار کر اڑا سکتا ہوں۔"

کرشید بڑی خوش ہو گئی۔ بڑی خوش ہو گئی۔ جس طرح کہ ہر عورت اس قسم کی بے معنی اور ہوائی تلوار سے خوش ہو جایا کرتی ہے۔ ان باتوں کے دوران میں نے کرشید کا سارا جسم ٹٹول لیا تھا۔ جس طرح ایک ماہر کھلاڑی کرکٹ کے میدان میں جا کر دیکھتا ہے کہ کہاں گیند پھینک کر گھمانا ہے اور کہاں پھینک کر اسے کھیلنے والے کی ٹانگوں پر دے مارنا ہے۔ کرشید کا جسم بڑا گرم اور تنا ہوا تھا۔ وہ ایک ایسے تار کی مانند تھی جسے ابھی تک مضروب نے چھیڑا نہ ہو۔ میری گستاخانہ اور بے باکانہ چھیڑ چھاڑ نے کرشید کو مزید گرم کر دیا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سرخ ہو کر بند سی ہونے لگیں اور مجھ سے بار بار لپٹنے لگی۔ اس نے اپنا سویٹر اتار دیا۔ پھر قمیض بھی اتار دی۔ اب صرف بنیان رہ گئی تھی۔ جس میں نے اتار دیا۔

"ہائے سردی ہے جانی۔"

"لحاف اوپر کر لو۔"

ہم دونوں لحاف کے اندر گھس گئے اور وحشیوں کی طرح ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ کرشید نے اپنے بدن پر بڑا گھٹیا قسم کا دیہاتی عطر مل رکھا تھا۔ اس عطر نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ مگر میں نے کوئی پرواہ نہ کی۔ اگر میرا دم گھٹ بھی جاتا تو میں لحاف سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ اب تو مجھے پولیس ہی آ کر اس لحاف سے باہر کھینچ سکتی تھی۔ بھلا اتنی سردی میں کون بیوقوف لحاف سے باہر نکلتا ہے۔

کرشید کا جسم گرم ہو کر سخت ہو گیا۔ اس کی پنڈلیوں کے اور میرے سر کے بال کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد ہم بھی پلنگ پر کھڑے ہو گئے لیکن سردی نے ہمیں پھر لحاف میں گھسنے پر مجبور کر دیا۔ لحاف اور عورت بہت سے کاموں پر انسان کو مجبور کر دیتے ہیں۔

کرشید کی آنکھیں بند تھیں۔ باہنیں میرے جسم کے گرد سختی سے لپٹی ہوئی تھیں اور وہ تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ ہم یک قالب و یک جاں ہو گئے تھے۔ یک نفس اور یک زباں ہو چکے تھے۔ بند لحاف کی گرم تاریکی میں چاروں طرف جنگل ہی جنگل پھیلا ہوا تھا۔ جس کی گھپاؤں میں ہم وحشی درندوں کی طرح ایک دوسرے کا گوشت نوچ رہے تھے۔ انسان واقعی درندہ ہے وہ ابھی تک جنگل میں ہے۔

جب ہم لحاف کے جنگل سے باہر نکلے تو ہم سردی کے باوجود پسینے میں نہائے ہوئے تھے۔ میں سگریٹ پی رہا تھا اور وہ کرشید میرے ساتھ لیٹی ہولے ہولے ماہیا گنگنا رہی تھی۔

"باگے وچ آیا کرو
سوہنے موہنے تاریاں دے
دو گیت سنایا کرو۔"

میں نے کہا۔

"کرشید! تم تو بڑا اچھا گا لیتی ہے۔"

"میں جب ڈھولک پر گاتی ہوں تو عورتیں مجھے دیکھتی ہی رہ جاتی ہیں۔"

"تم ریڈیو پر کیوں نہیں گاتیں۔"

کرشید ہنس پڑی۔

"مجھے شرم آتی ہے۔"

یہ وہ عورت کہہ رہی تھی جسے ابھی میں نے جنگل میں انتہائی بے شرمی کی حرکات کرتے دیکھا تھا۔ انسان کی فطرت کتنی جھوٹی ہے۔ وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے۔ ساری دنیا کو دھوکا دیتا ہے اور ہر انسان سے اصلیت چھپاتا ہے۔ ہم دونوں پچھلے پہر تک ساتھ ساتھ لیٹے رہے اور کئی بار جنگلوں میں چھپ کر آنکھ مچولی کھیلتے رہے۔ جب چار بجے تو میں نے کہا۔

"اب میں جاتا ہوں کرشید۔"

"میرا م دل توڑ کر مت جاؤ جانی۔"

"جانی میں اگلے منگل کو یہ دل پھر جوڑ دوں گا۔"

محمد طارق اقبال پاکستانی ڈائجسٹ ڈاٹ کام

"اگلے منگل کو پھر آنا۔"

"ضرور آؤں گی۔"

"بھولنا نہیں۔"

"کبھی نہیں جاتی۔"

میں نے بادل نخواستہ کرشید کا بوسہ لیا۔ کیونکہ میں اب اتنا تھک کر چور ہو گیا تھا اور میرے لئے کرشید کے سراپا میں کوئی دلچسپی اور لذت باقی نہیں رہی تھی۔ میں تو اتنا بھر گیا تھا کہ اگلے منگل کسی پہاڑ کے غار میں چپ چاپ بیٹھ سکتا تھا۔ کرشید مجھ سے چمٹ گئی مجھے یوں لگا جیسے میں نے کھال اترے ذبح شدہ ٹھنڈے بکرے کو گلے سے لگا رکھا ہو۔ میں نے ایک جھرجھری سی لی اور جلدی جلدی سیڑھیاں اتر کر باہر سڑک پر آگیا۔ کرشید کھڑکی میں کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کا دل رکھنے اور اگلے منگل کی بات پکی کرنے کے خیال سے اسے مڑ کر دیکھا۔ مسکرایا اور موڑ گھوم گیا۔

کوٹھڑی میں سب ڈرائیور ابھی تک سو رہے تھے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی تھی کہ میں کرشید کے ساتھ گہرے سمندروں کے پاتال کھنگال آیا تھا۔ میرا جسم تھکا ہوا اور سردی میں ٹھٹھر رہا تھا۔ میں لحاف میں گھستے ہی سو گیا۔ اور صبح کوئی دس بجے اٹھا۔ گامی باکسر نے مجھے آکر جگایا۔

"بٹ جی آج کیا بات ہے۔ گھوڑے بیچ کر سو رہے ہیں؟"

"کیا بج گیا؟"

"دس بج رہے ہیں۔ لاریاں پٹرول پمپ پر کھڑی ہیں۔"

میں جلدی سے اٹھا۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے پہنے اور پٹرول پمپ پر آگیا۔ کرشید کی کھڑکی بند تھی۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد اس کی کھڑکی کھلی اور کرشید نے مجھے مسکرا کر دیکھا۔ وہ ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کا گنجا ادھیڑ عمر کا خاوند ایک بغل میں بستہ دبا کر مکان کے دروازے سے نکلا اور ایک طرف کو چل پڑا۔ مجھے اس پر بڑا ترس آیا اور اپنے آپ پر کمینگی کا احساس ہوا۔

کیول کو میں نے دکان پر جا کر رات کی ساری کہانی سنا دی۔ اب اسے یہ بھی بتا دیا کہ وہ عورت کون ہے۔ اس نے پوری دلچسپی سے میری داستان سنی اور مسکراتا رہا۔

"ارے وہ تو بڑی کائیاں عورت ہے۔ کئی لوگوں کو کھا پی کر ہضم کر چکی ہے۔ پہلے وہ لائل پور میں رہتی تھی۔ کوئی دو سال سے سرگودھا میں مقیم ہے۔ دراصل اس کا خاوند نامرد ہے۔"

میں نے سگریٹ پھینک کر کہا۔

"یار کیول! مجھے تو اپنے کئے پر بڑی ندامت ہو رہی ہے۔ گناہ تو میں کر چکا ہوں اب اس کے تلخ احساس سے پیچھا نہیں چھوٹ رہا۔"

کیول نے سنجیدہ منہ بنا کر کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ حقیقت میں برے کام کا نتیجہ برا ہوتا ہے۔ یہ کام جو ہم لوگ کرتے پھرتے ہیں برے ہیں۔ اور ان سے ہمارے من کو کبھی شانتی نہیں مل سکتی۔"

"پھر کیا کیا جائے کیول؟ اس زندگی کے تقاضے کیسے پورے ہوں؟"

کیول نے مسکرا کر کہا۔

"شادی کر لو۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"من کو شانتی مل جائے گی۔"

"میں نے تو شادی شدہ لوگوں کو زیادہ پریشان دیکھا ہے"

ٹھیک ہے ان کی پریشانی دماغ کی پریشانی ہوتی ہے۔ ان کے من شانت ہوتے ہیں۔"

"پریشانی تو بہر حال ہوتی ہی ہے ناں۔"

"ہوتی ہے لیکن دماغ کی پریشانی اور دل کی ندامت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"تو میں کیا کروں۔"

"اگلی منگل کو اس کے ہاں مت جانا"

"ٹھیک ہے۔ میں بالکل نہیں جاؤں گا"

"شاید تم ایسا نہ کر سکو"

"کیوں"

کیول ہنسنے لگا۔

"بھیا جوانی میں اس منہ زور گھوڑے کو لگام ڈالنا بڑا جان جوکھوں کا کام ہوتا ہے۔"

"کچھ بھی ہو کیول میں اب ایسی کمینگی کبھی نہیں کروں گا۔"

"بھگوان کرے کہ تم ایسا نہ کر سکو۔"

میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگلے منگل کو کرشید کے گھر کسی حالت میں بھی نہیں جاؤں گا۔ میں اپنے آپ کو گناہ کی دلدل میں نہیں پھنسانا چاہتا تھا۔ مگر وہ الو کی پٹھی ہر روز کھڑکی میں ہوتی اور مجھے اشارے کرتی رہتی اور اگلی منگل کی یاد دہانی کراتی رہتی۔ جوں جوں منگل قریب آرہا تھا میرا اپنے ضمیر کے ساتھ دنگل زیادہ تیز ہو رہا تھا۔ منگل کی دوپہر کو میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اب کرشید کی سیڑھیوں پر کبھی نہیں چڑھوں گا۔ لیکن شام کو کرشید کے لحاف کا جنگل یاد آنے لگا اور رات کو میں نے اس لڑائی میں ہتھیار ڈال دیئے اور چاروں شانے چت میدان میں گر پڑا۔

پورے گیارہ بجے بستر پر سے اٹھا اور کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر کرشید کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس روز موسم کچھ ابر آلود تھا۔ اگرچہ بارش نہیں ہوئی تھی لیکن ہوا بڑی سرد چل رہی تھی۔ جنوری کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ سرما اپنے جوبن پر تھا۔ میں نے حسب معمول کرشید کے اوپر والے دروازے میں کھڑے ہو کر دیا سلائی جلائی۔ سیڑھیوں میں روشنی ہو گئی اور کرشید کا بھوت نما سایہ پیچھے دیوار پر لہرانے لگا۔ میں اوپر گیا تو وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کے جسم سے دیہاتی عطر کی تیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ لیمپ کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ آج اس نے آنکھوں میں سرمہ بھی ڈال رکھا تھا۔ اور ہونٹوں پر لپ سٹک لگا رکھی تھی۔ اس نے انگیٹھی پر دودھ گرم کر کے رکھا ہوا تھا۔ اندر جاتے ہی اس نے مجھے گرم گرم دودھ کا ایک پیالہ دیا۔ دودھ پی کر میرا جسم گرم ہو گیا اور سردی کا احساس کچھ زائل ہوا۔

"میں جانتی تھی کہ تم ضرور آؤ گے۔ میں تو شام سے بیٹھی تمہارا انتظار کر رہی تھی"

میں نے سگریٹ سلگا کر کہا۔

"میرا دل بھی تمہیں ملنے کو بے تاب تھا کرشید"

"وہ تو ظاہر ہے دل کو دل سے راہ ہوتی ہے"

میں نے کہا۔

"جب تک میری جان میں جان ہے۔ مجھے تم سے ملنے میں کوئی نہیں روک سکتا۔"

میں سر جھکا کر چپ چاپ سگریٹ پیتا رہتا۔

"کیا بات ہے تم کچھ اداس ہو؟"

میں نے خورشید کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"دل کہتا ہے تم گناہ کر رہے ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

کرشید نے بڑے دلبرانہ انداز میں مجھے مسکرا کر دیکھا اور میرے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔

"چھوڑو ان باتوں کو جانی۔ یہ وقت پیار کرنے کا ہے۔ سوچنے کا نہیں۔"

اس نے میرا منہ چوم لیا اور پلنگ پر بیٹھتے ہی کپڑے اتارنے شروع کر دیئے۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی مشاق رنڈی کے کمرے میں بیٹھا ہوں۔ مجھے اس کمرے کی فضا سے گھن آنے لگی۔ سامنے دیوار پر ایک کیلنڈر لگا تھا جس پر بادشاہی مسجد کی تصویر تھی۔ پہلے منگل کو مجھے یہ تصویر کی اہمیت کا احساس نہ ہوا تھا۔ لیکن آج یہ مسجد میرے ضمیر کو ملامت کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کرشید مادر زاد برہنہ ہو کر بیٹھی دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنے بالوں کا جوڑا بنا رہی تھی۔ میرے بدن میں آگ سی لگ گئی۔ میں نے آنکھیں دوسری جانب کر لیں اور جیب سے دوسرا سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ کرشید نے مجھے پیچھے لٹا لیا اور میری گردن پکڑ کر کہا۔

"میرا جانی چپ کیوں ہے؟ پھر میں طبیعت خوش کر دوں؟"

اس عورت کا نرم جسم میرے ساتھ لگا تھا اور میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ سر کے بال کھڑے ہو گئے تھے اور ضمیر کی آواز دبنے لگی تھی۔ جیسے کوئی بڑے کنوئیں میں کراہ رہا ہو۔

میں نے کہا۔

"کرشید! یہ کیلنڈر دیوار پر الٹا کر دو۔"

وہ ہنس پڑی۔

"یہ بات تھی۔"

اس کے ساتھ ہی وہ برہنہ کی برہنہ پلنگ پر سے اٹھی اور ہاتھ بڑھا کر دیوار کے ساتھ لگا ہوا کیلنڈر الٹا کر دیا۔

"لیمپ کی بتی نیچی کر دو"

وہ ایک بار پھر ہنسی اور اس نے لیمپ کی بتی کو نیچے کر دیا۔ کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا

چھا گیا۔ کرشید بھاگ کر پلنگ پر آ گئی اور لحاف میں گھس گئی۔

"اب اندر آجاؤ ناں جانی۔ باہر سردی میں کیوں بیٹھے ہو؟"

میں اٹھا۔ کپڑے اتارے اور لحاف میں گھس گیا۔ کرشید نے میرے ساتھ لگ کر ماہیا گنگنانا شروع کر دیا۔ اس کی آواز مجھے زہر لگ رہی تھی۔ مگر جسم گرم گرم شہد بن کر میرے جسم میں حل ہو رہا تھا۔ سرائیت کر رہا تھا۔ میرا ضمیر برابر مجھے ملامت کر رہا تھا۔ میں اس کے ہر حملے کا مقابلہ کر رہا تھا۔ آخر وہ ملامت کرتے اور میں مقابلہ کرتے تنگ آ گیا۔ اس نے تلوار نیام میں کر لی اور میں نے ڈھال زمین پر رکھ دی۔ محاذ پر چاروں طرف خاموشی طاری ہو گئی۔ اب میں بھی لحاف کے اندر تھا۔ جنگل کے اندر تھا اور ہماری خرمستیاں شروع ہو چکی تھیں

کوئی تین گھنٹے بعد ہم جنگل سے باہر نکل آئے۔ کپڑے پہنے۔ دودھ کا ایک ایک پیالہ پیا میں نے سگریٹ سلگا لیا اور کرشید گرم شال اوڑھ کر میرے کندھے پر سر رکھ کر بیٹھ گئی۔ پھر آہ بھر کر بولی۔

"جانی! اب تو مجھ سے تمہارے بغیر نہیں رہا جاتا۔"

میں نے دل میں کہا۔ "تو پھر میں کیا کروں؟" اوپر سے کہا۔

"کیا میں بہت یاد آتا ہوں؟"

"اتنا یاد آتے ہو جانی کہ میں روتی رہتی ہوں۔"

میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ ایک تو اب میرے لئے اس کے جسم میں کوئی دلکشی نہیں رہی تھی۔ دوسرے اب ایک بار پھر میرا ضمیر پوری شدت سے ملامت کرنے لگا تھا۔ کرشید بولی۔

"جانی! میرے ساتھ کہیں بھاگ چلو۔"

میں اچھل سا گیا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو کمینی عورت!" میں نے دل ہی دل میں کہا۔

کرشید نے اپنی بکواس جاری رکھی۔

"میرے پاس چھ سو کا زیور ہے۔ کچھ نقد روپے ہیں۔ میں یہ سب کچھ تمہارے حوالے کرتی ہوں۔ مجھے ساتھ لے کر کسی دوسرے شہر میں چلے چلو۔ وہاں جا کر ہم شادی کر

لیں گے۔ یا اگر ایسا نہ بھی کر سکے تو یار بن کر رہیں گے اور ساری زندگی عیش کریں گے۔ میں اپنے خاوند کے ساتھ رہ کر تنگ آ گئی ہوں۔ مجھے تم سے محبت بھی ہو گئی ہے۔ تم میرے بدن میں آگ لگا کر خود ٹھنڈے ہو کر چلے جاتے ہو۔ پھر جو مجھ پر گزرتی ہے اسے میں ہی جانتی ہوں۔''

میں نے کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کرشید؟ تمہارے خاوند نے پولیس میں رپورٹ درج کروا دی تو ہم دونوں جہاں بھی ہوں گے گرفتار کر لئے جائیں گے۔''

کرشید گردن اٹھا کر بولی۔

''میں عدالت میں بیان دے دوں گی کہ میں اپنے خاوند کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ میں اس سے تنگ آ چکی ہوں۔ وہ نامرد ہے۔''

''مگر مجھ پر زیور چرانے اور کسی کی بیوی اغوا کرنے کی فرد جرم لگے گی۔''

''میں کہہ دوں گی کہ میں اپنی مرضی سے آئی ہوں۔''

''پھر کیا ہو گا۔''

''ہم شادی کر لیں گے۔ میرا خاوند مجھے طلاق دے دے گا۔''

''اگر اس نے طلاق نہ دی تو؟''

''اس کا باپ بھی دے گا۔''

''اگر اس کے باپ نے بھی ایسا کام نہ کیا تو؟''

''تو میں اس کا سر توڑ دوں گی۔''

''تو یہ کام تم پہلے ہی کیوں نہیں کر لیتی؟''

''اگر تم میرے ساتھ شریک ہو جاؤ تو ہم مل کر اسے ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔''

میری تو روح کانپ اٹھی۔ مجھے وہ عورتیں یاد آ گئیں جو اپنے آشناؤں کے ساتھ مل کر اپنے خاوندوں کا قلع قمع کروا دیا کرتی ہیں اور پھر پھانسی کے تختے پر جا پہنچتی ہیں۔ اور اپنے آشناؤں کو بھی وہیں پہنچا دیتی ہیں۔ کرشید اس وقت پوری چڑیل معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے دل میں کہا کہ کمینی عورت! اب میں تمہاری سیڑھیاں کبھی نہیں چڑھتا۔ فکر نہ کرو۔۔۔ کرشید مجھے اس مہیب اور خوفناک فعل پر راغب کرنے لگی۔ جب مجھے احساس ہوا کہ یہ عورت

چڑیل ہے اور انتہائی بدمعاش ہے تو میرا جسم گرم ہو گیا اور میں اسے ساتھ لے کر ایک بار پھر جنگل میں گھس گیا۔ میں اس خاردار جنگل میں اب کی دفعہ کرشید کی عریاں خون آلود لاش کو میلوں گھسٹتا پھرا۔ پھر وہ ادھ موئی ہو گئی اور کتے کی طرح ہانپنے لگی۔ میں دراصل اس سے اپنے ضمیر کی ملامت کا بدلہ لے رہا تھا۔ واپسی پر میں اسے تسلی دے آیا کہ میں اس کے ساتھ مل کر ادھیڑ خاوند کا ضرور کچھ نہ کچھ کروں گا۔ باہر بازار میں آ کر میں نے زور سے تھوکا اور ڈیرے کی طرف چل پڑا۔ مشرق کی جانب صبح کی جھلکیاں نمودار ھو گئی تھیں اور ایک بڑا سا روشن ستارہ بھڑک بھڑک مجھے شرم دلا رہا تھا اور میں اس سے آنکھیں نہیں ملا رہا تھا۔

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

11

اس کے بعد میں کرشید کے اشاروں کا جواب دینا بند کر دیا۔

وہ کھڑکی میں کھڑی رہتی۔ میں پٹرول پمپ پر کھڑا پٹرول کا حساب کرتا رہتا۔ وہ اشارے کرتی اور میں اس کا کوئی جواب نہ دیتا۔ منگل وار کو بھی میں اس کے گھر نہ گیا۔ کرشید حیران ہو گئی اب وہ مجھے کیلے دکھانے لگی۔ پھر جوتیاں دکھانے لگی اور پھر اس وقت تک کھڑکی بند رکھتی جب تک کہ میں پٹرول پمپ پر کھڑا رہتا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ چڑیل سے پیچھا چھوٹا۔ عورت کیا تھی قتل کا مقدمہ تھی۔ اس سے تو میری شانتا کوبلی ہی اچھی ہے۔ کیا ہوا جو کیلے بہت کھاتی ہے۔ بیچاری بالکل گائے ہے۔ گائے کی طرح بات کرتی ہے۔ گائے کی طرح دیر میں سمجھتی ہے اور گائے کی طرح کیلے کھاتی ہے۔

زندہ باد بھگت کبیر کی بھگتنی!

ایک شام خواجہ بینڈک ایک قریبی گاؤں میں لاری لے کر گھی لینے جانے لگا تو میں بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا۔ اس خیال سے کہ گاؤں کی سیر کریں گے۔ یہ گاؤں خوشاب کے طرف سرگودھا سے کوئی گیارہ میل کے فاصلے پر تھا۔ اور چاروں طرف سے خشک اور بنجر چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ کچے کچے چند ایک بوسیدہ کوٹھے تھے۔ ایک چھپڑ تھا۔ جس میں گندی بطخیں تیر رہی تھیں۔ ایک حویلی تھی جس کے دروازے پر دو بیل بندھے تھے اور ایک بھینس بیٹھی جگالی کرتے ہوئے ڈکرا رہی تھی۔ گاؤں کے مکانوں کے باہر شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ پہاڑیوں کے اوپر شام کا ستارہ چمکنے لگا تھا۔ سردی تھی اور مکانوں کا دھواں اوپر جمع ہو رہا تھا۔ دیہاتی بچے مٹی میں کھیل رہے تھے۔ ایک جگہ گنے بیچے جا رہے تھے ۔ ایک جھکی ہوئی دکان میں ایک دیہاتی گھی تول رہا تھا۔ خواجہ بینڈک نے لاری میدان میں مکانوں کے سامنے کھڑی کی تو بچے شور مچاتے بھاگ کر اس کے گرد آن کھڑے ہوئے۔ دو تین لڑکیاں سروں پر مٹکے اٹھائے لاری کے قریب سے گزریں۔ انہوں نے مڑ کر لاری کو دیکھا اور آپس میں کوئی بات کر کے کہ آگے چل دیں۔ خواجہ نے گلوبند سے اپنے سر کی گرد جھاڑ کر کہا۔

"بھن یاوا یہاں سوائے گرد کے اور کچھ ہوتا ہی نہی۔"

اس نے اپنا ٹین گھی والے کی دکان پر جا کر رکھ دیا۔

"لو جی ملک دس سیر ڈال دو بس زرا مکھن ہی ہو۔"

دکاندار کی مونچھوں پر لگا ہوا گھی دیئے کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

"بھرا جی ہمارے ہاں تو زرا مکھن ہی ملے گا آپ کو۔"

"اجی آج کل تو گاؤں میں بھی ملاوٹ ہونے لگی ہے۔"

"توبہ کرو بھرا جی! ملاوٹ کرنے والے کے منہ میں خاک۔"

"اور ہمارے منہ میں گھی شکر"

پھر خواجہ خود ہی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

شام کا ستارہ پہاڑیوں کی اوپر گہرے نیلے آسمان پر تیزی سے چمکنے لگا تھا۔ مکانوں سے اٹھتا ہوا دھواں رات کے بڑھتے ہوئے اندھیروں میں گم ہو رہا تھا۔ گاؤں کی دوسری جانب کتے بھونکنے اور لڑنے لگے۔ بچوں نے لاری کے گرد شور مچا رکھا تھا۔ خواجہ نے وہیں سے انہیں ڈانٹا۔

"خبردار جو کسی نے لاری کو ہاتھ لگایا۔"

گندے تالاب میں میلی کچیلی بطخیں قیں قیں کر رہی تھیں۔ کسی کسی مکان کے اندر آگ جلنے کی روشنی دکھائی دینے لگی تھی۔ میدان میں گرد اڑ رہی تھی۔ یہ منظر اس قدر اکتا دینے والا تھا کہ میں اداس ہو گیا اور مجھے موت کا خیال آنے لگا۔ دل بس یہی چاہنے لگا کہ ابھی چل کر لحاف میں گھس جاؤ اور پھر کبھی باہر نہ نکلو۔ نہ جانے کبھی کبھی انسان پر موت ایسی افسردگی کیوں طاری ہو جاتی ہے۔ کیا کبھی موت کے بعد انسان کو اپنی زندگی کا احساس ہوتا ہے؟ دکاندار نے گھی تول کر ٹین میں ڈال دیا۔ خواجہ نے وہیں سے کچھ گنے لئے۔ گنوں کا گٹھا لاری کے پیچھے پھینکا۔ گھی کا ٹین اپنے پاس اگلی سیٹ کے نیچے رکھا۔ ہم دونوں لاری میں بیٹھ گئے۔ کھڑکیاں بند کر دیں۔ کلینر نے ہینڈل مارا اور خواجہ گاڑی کو موڑنے لگا۔ دیہاتی لونڈوں نے تالیاں بجا بجا کر اچھل اچھل کر شور مچانا شروع کر دیا۔

جب لاری اس اداس کر دینے والے گاؤں سے باہر نکلی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

کیونکہ اس مردہ اور بے جان ماحول میں رہ کر میری طبعیت میں گناہ کرنے کی خواہش نے پاؤں نے جمانا شروع کر دیئے تھے۔ ڈیرے پر پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ شہر کی دکانوں کی روشنیاں اور پختہ دو منزلہ مکانوں کی کھڑکیوں کو دیکھ کر طبعیت ایک بار پھر بشاش ہو گئی اور گناہ کا خیال کوسوں دور بھاگ گیا۔ ڈیرے پر پہنچ کر خواجہ نے آدھا گھی دوسرے ڈیرے پر پہنچا دیا۔ گامی باکسر نے گھی میں انگلی ڈبو کر چاٹی اور بولا۔

''گھی خالص ہے۔''

اور باقی سر پر مل لیا۔

کلینر کوبی الفتہ ان ہی دنوں فیروز پور گیا تھا۔ واپسی پر اس نے مجھے اپنی محبوبہ طوائف ممتاز سے ملاقات کی ایک طویل کہانی سنائی۔

''باؤجی ! کیا بتاؤں۔ بے چاری مجھے دیکھتے ہی رو پڑی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ کہنے لگی۔ کوبی ! تو نے مجھے بھلا کیوں دیا ؟ میں تو ہر روز تمہیں ایک خط لکھتا تھا۔ بولی ٹھیک خط تو مجھے ہر دوسرے روز مل جاتا تھا۔ لیکن میرے پیارے خالی خطوں سے کیا ہوتا ہے۔ اصل چیز تو یار کا وصال ہوتا ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ کوبی الفتہ جھوٹ بول رہا ہے۔ کیونکہ کوئی دو ماہ سے مجھ سے جو خط لکھوائے تھے وہ میں نے سارے اپنے رشتہ داروں کو پوسٹ کر دیئے تھے۔

''کہنے لگی آ جا میری جان اور میرے گلے لگ جا۔ بس بابو جی!''

''پورا ایک ہفتہ اپنی ممتاز کے گھر پر ہی رہا۔ صبح سری پاوے سے ناشتہ کرواتی۔ دوپہر کو ککڑ کھلاتی۔ رات کو پلاؤ کھلاتی اور پیسٹری کے ساتھ چائے پلاتی۔ رات کو میرے ساتھ لگ کر سوتی۔ مجرا اس نے میرے جاتے ہی ہفتے کی لئے بند کر دیا تھا۔ تماش بین آ آ کر مڑ جاتے اور وہ طمنچہ جان میری بغل میں دبک کر بیٹھی رہتی۔''

میں نے کہا۔

''جب تو وہ تم سے بڑی محبت کرتی ہے کوبی۔''

کوبی نے آنکھیں کھول کر کہا۔

باؤجی آپس کی بات ہے کیا بتاؤں۔ وہ تو مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ کہنے لگی کوبی جی مجھ سے چار کلمے پڑھوا لو۔ یہ بلڈنگ تمہارے نام کرتی ہوں اور سارا زیور قدموں پر رکھتی

ے۔''

''پھر تم راضی کیوں نہ ہوئے؟''

کوبی نے مسکرا کر کہا۔

''باؤجی! ہم بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے۔ رنڈی کی محبت کا کیا اعتبار۔ آج شادی کرے اور کل کسی دوسرے کے پاس جا کر اس کی بغل گرم کرتی پھرے۔ پھر تو میری بیوی کسی اور کے ساتھ رہے گی۔ اور ہوگی۔

''بدنامی! اسے تو کوئی نہیں پوچھے گا۔''

''لیکن تم بلڈنگ ہضم کر جانا اور چھوڑ دینا۔''

''نہیں باؤجی! مجھ سے رنڈی کا مال نہیں کھایا جاتا۔''

لیکن وہ بقول اپنے رنڈی کے ہاں سات روز ہ کر مرغ، پلاؤ اور سری پائے خوب کھاتا رہا تھا۔ ادھر یوسی پھینے نے ایک رات شراب کے نشے میں دھت ہو کر بازار میں نکل اودھم مچانا شروع کر دیا اور امام مسجد کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ اکا ڈرائیور اسے پکڑتا ہی رہ گیا۔ لیکن چونکہ وہ خود نشے میں تھا۔ اس لئے اسے قابو نہ کر سکا۔ بازار میں لوگ جمع ہو گئے اور یوسی شرابی کی باتوں کا مزا لینے لگے۔

دوسرے ڈرائیور بھاگ کر نیچے گئے اور یوسی کو اٹھا کر اوپر لائے۔ سردار خاں کو معلوم ہوا تو وہ رات کو ڈیرے پر آیا۔ اس نے یوسی پھینے کو متنبہ کر دیا کہ اگر پھر اس نے ایسی حرکت کی تو اسے نوکری سے جواب دے دیا جائے گا۔ یوسی نشے میں تھا اور آنکھیں گھما گھما کر کمرے میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ خشک تھے اور گال زرد ہو رہے تھے۔

وہ سردار خاں کے سامنے کچھ نہ بولا۔ جب سردار خاں چلا گیا تو غرایا۔

''نوکری کیا ہے؟ عزت کے مقابلے میں نوکری کیا ہے؟ لوگ ہمیں بدمعاش کہیں اور ہم چپ چاپ رہیں کیوں اکے بولتے کیوں نہیں؟''

''سالے تو نے مجھے شریف بنایا تھا۔ دیکھ شرافت کا نتیجہ؟''

اکے ڈرائیور نے نشے میں کھڑکھڑا کر اٹھتے ہوئے کہا۔

''کمینے تو ذلیل کرتا ہے۔ سب کو ذلیل کرتا ہے۔ حرام زادے اس کوٹھڑی میں رہ کر تو قتل بھی کر دے تو کچھ نہ ہوگا۔ تو باہر کیوں بھاگ جاتا ہے؟''

"چپ کر جا کے چپ کر جا۔"

دوسرے روز میں دوپہر کے بعد کیول کی دکان پر بیٹھا تھا کہ اچانک وہاں شانتا کو بلی آ گئی۔ منگل کے منگل ملنے والی خوفناک عورت کے تجربے کے بعد مجھے شانتا بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ اس نے نہا دھو کر صاف کپڑے پہنے ہوئے تھے اور داتن بھی کیا ہوا تھا۔ جس کے وجہ سے اس کے ہونٹوں پر براؤن رنگ آیا ہوا تھا۔ میں نے نمستے کیا۔ شانتا نے مسکرا کر نمستے کا جواب دیا اور شرم سے اس کے گال سرخ ہو گئے۔ کیول سیٹھی بہانہ بنا کر اندر کوٹھڑی میں چلا گیا۔ میں نے شانتا سے کہا۔

"تم ملتی ہی نہیں شانتا! کیا کوئی ناراضگی ہے؟"

شانتا نے ناک سکیڑ کر کہا۔

"جاؤ ہم تم سے نہیں بولتے۔"

"آخر میرا قصور؟"

"تم مرد بڑے بے وفا ہوتے ہو۔ بھنوروں کی طرح کلیوں کا رس چوس کر اڑ جاتے ہو؟"

شانتا کالی داس کی شکنتلا کی زبان میں بات کر رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"لیکن شانتا میں تم سے پریم کرتا ہوں۔ کل بھی تم سے پریم کرتا تھا۔ آج بھی تم سے پریم کرتا ہوں اور ہمیشہ کرتا رہوں گا۔"

"تمہارے پریم سے مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں ایسا پریم نہیں چاہتی۔"

"اچھا تو جیسا کہو گی میں ویسا ہی پریم کروں گا۔ لیکن تم کبھی ملو تو سہی۔ تم تو کبھی نظر ہی نہیں آتیں۔"

"میں کل صبح مندر جاؤں گی۔ وہاں آ جانا۔"

"کہاں ہے مندر؟"

"کالی ماتا کا مندر ـــــــ نہر پار جو ہے۔"

"بھول مت جانا۔"

"کوئی پجاری مندر جانا نہیں بھول سکتا۔"

"مگر شانتا تم تو خود ایک مورتی ہو۔ لوگوں کو تو تمہاری پوجا کرنی چاہیئے۔"

محمد طارق اقبال
پاکستان ورچوئل لائبریری
ڈاٹ کام

شانتا مسکرادی۔ کیول سیٹھی باہر آگیا۔

"ویرجی! ایک دوات سوان انک کی دے دیں۔"

شانتا چلی گئی۔ میں نے کیول کو بتایا کہ شانتا نے مجھے کل صبح کالی کے مندر میں بلایا ہے۔ کیول بولا۔

"مندر کے اندر مت جانا۔ وہاں کوئی مسلمان داخل نہیں ہوسکتا۔"

"میں تو پھر ضرور اندر جاؤں گا۔"

"عاشق سے زیادہ کوئی محتاط اور بے احتیاط نہ ہوتا۔"

"ٹھیک ہے بھائی۔"

"فکر نہ کرو۔ میں رکشے میں ہی بیٹھ کر جاؤں گا۔"

دوسرے روز میں صبح صبح سیر سے واپس آکر کالی کی مندر کے باہر جا پہنچا۔

کچھ لوگ مرد اور عورتیں رام نام کا جاپ کرتیں، ہاتھوں میں رتن جو کے پھولوں سے بھری ہوئی تھالیاں اور مٹھائی لئے مندر میں پوجا کرنے جا رہی تھیں۔ باہر رتن جو کے پھول بک رہے تھے۔ میں نے پاجامہ اور سر پر گلو بند لپیٹ رکھا تھا۔ میں نے پھولوں کے دو تین ہار خریدے اور جب دور سے شانتا کو مندر کی طرف آتے دیکھا تو میں بھی رام رام کرتا مندر میں داخل ہوگیا۔

دوسرے پجاریوں کی طرح میں نے ڈیوڑھی والے ٹل کو ہاتھ سے ہلا کر بجایا۔ اس ڈیوڑھی سے گزر کر مندر کے صحن میں آگیا۔ یہاں ایک درخت تلے کچھ سادھو بیٹھے گانجا پی رہے تھے۔ جس کمرے میں کالی کا بت تھا اس کے دروازے پر ایک مہنت کمبل اوڑھے بیٹھا تھا اور پجاریوں سے پیسے، مٹھائی وصول کر رہا تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر اسے چھ آنے دیئے اور اندر داخل ہوگیا۔ کالی کا سرخ ہونٹوں اور سرخ باہر نکلی ہوئی زبان والا خوفناک بت دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا اور مجھے اپنی ہولناک آنکھوں سے گھور رہا تھا۔ میں نے دوسرے پجاریوں کی طرح اس بت کے قدموں میں پھول رکھے اور ایک طرف دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ فضا اگر بیتیوں کی دھوئیں سے بھر گئی تھی اور خوشبو سے ناک میں دم آرہا تھا۔ کالی کے قدموں میں پھولوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ عورتیں بیٹھی سر ہلا ہلا کر پاٹھ کر رہی تھیں۔ کسی نے بیمار بچہ اٹھا رکھا تھا۔ کوئی ویسے پرارتھنا کر رہی تھی۔ اتنے میں شانتا بھی اندر آگئی۔ اس

نے سفید ساڑھی پہن رکھی تھی اور پاؤں سے ننگی تھی۔ ماتھے پر صندل کا تلک لگا تھا اور بال سفید ساڑھی کی پلو میں کھلے ہوئے تھے اور یونہی ربن سے بندھے تھے۔

آج وہ بڑی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔ اور جب اس نے ایک نظر مجھے دیکھنے کے بعد کالی کے چرنوں میں پھول ارپن کر کے آنکھیں بند کیں تو اس کے بعد وہ میرے قریب آ کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹوں پر کچھ بڑبڑاتے ہوئے آہستہ آہستہ بل رہی تھی۔ وہیں بیٹھی ایک موٹی سی عورت نے ایک بھجن گانا شروع کر دیا۔

ارے دل غافل غفلت مت کر
ایک دن جم تیرے آوے گا
سودا کرنے گھر سے نکلا
پونجی کھوئی لال گنوایا
پریم نگر کا انت نہ پایا
جو سو جاوے گا
سن میرے ساجن سن میرے میتا
یاں جیون میں کیا کیا کھوٹا
کر پاہن کا بوجھ لپیٹا
آگے کون چھڑاوے گا
داس کبیر کہے سمجھاوے سنگ نہ کوئی جاوے گا
ارے دل عافل غفلت مت کر۔

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

میں چوکنا ہو گیا۔ بھگت کبیر صاحب یہاں بھی رنگ میں بھنگ ڈالنے آ پہنچے تھے۔ میں نے کنکھیوں سے شانتا کو دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔ یا اللہ! یہ میں کہاں آ گیا ہوں؟ یہ کیسا پریم شانتا مجھ سے طلب کر رہی ہے؟ ایسا پریم تو کوئی پتھر کی مورتی کو ہی دے سکتا ہے۔ زندہ گوشت پوست کے انسان سے تو ایسا پریم کبھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ پریم تو لکڑی کی تلوار ہے جو مردے کی ناک بھی نہیں کاٹ سکتی۔ شانتا آنکھیں بند کئے بھگوان کو یاد کر رہی تھی۔ اگر اسے یہی کچھ کرنا تھا تو مجھے وہاں بھنگ گھوٹنے کے لئے بلایا تھا پھر؟ میں

کھسکتے کھسکتے اور رام رام کرتے شانتا کے ذرا قریب ہو گیا۔ میں نے اسے کہنی کا ٹھوکا دیا اس نے چونک کر مجھے دیکھا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"رام رام۔۔۔۔۔۔۔۔"

اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ میں ڈر کر پرے ہٹ گیا۔ یہ عورت تھی یا لومڑی؟ اس وقت شانتا مجھے کالی ماتا کی مورتی ایسی نظر آئی۔ مجھے یوں لگا اگر میں نے اب اسے بلایا تو وہ اپنی لال لال خون آشام زبان نکال کر مجھ پر حملہ کر دے گی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے میری کھال ادھیڑ کر رکھ دے گی۔ لیکن آخر شانتا ناٹے قد کی بھرے بھرے بدن والی لڑکی تھی اور ایسی لڑکیاں میری کمزوری ہوتی ہیں۔ میں چوری چوری اس کے جسم کے نشیب و فراز گنتا رہا اور سوچتا رہا کہ شانتا سے اس کے بھگت کبیر اور کالی ماتا کا کیسے کیسے انتقام لیا جا سکتا ہے۔ آخر شانتا نے مجھے یہاں کالی ماتا کی پوجا کے لئے بلایا تھا؟ میں صرف شانتا کی پوجا کر سکتا ہوں اور وہ بھی ایسی صورت میں جبکہ اس کی مورتی میرے سامنے نہ ہو بلکہ وہ خود موجود ہو۔

وہ موٹی عورت کبیر کا بھجن گا کر شانتا کو بت بنا کر اور میری کشتی میں پتھر ڈال کر مندر سے نکل کر جا چکی تھی۔ کچھ دوسری عورتیں وہاں آن بیٹھی تھیں اور اشلوک پڑھ رہی تھیں۔ خدا خدا کر کے شانتا کی پوجا ختم ہوئی۔ اس نے گیان دھیان سے چونک کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

"تم کب سے یہاں بیٹھے ہو؟"

"جب سے یہ سامنے کالی ماتا کا بت یہاں رکھا ہے۔"

"تمہیں یہاں کسی نے آنے سے تو نہیں روکا؟"

"اب سوچتا ہوں کہ روک ہی لیا جاتا تو اچھا تھا۔"

"وہ کیوں؟"

"تم جو بت بنی میرے پاس بیٹھی رہیں۔"

"ہائے کیا کروں بھگوان کو بھی تو یاد کرنا ہوتا ہے بھٹ جی۔"

"کبھی ہم غریبوں کو بھی یاد کر لیا کرو شانتا۔"

"بے وفا مردوں کو یاد کر کے کیا لینا؟"

"کون بے وفا ہیں؟"

"اور کون میں۔"

"میں تو تمہیں ہی بے وفا سمجھتا ہوں شانتا۔"

"رام رام کرو بھٹ جی۔"

میں نے جلدی سے کہا۔

"رام رام۔"

شانتا ہنس پڑی اور داتن لگے براؤن ہونٹوں کے پیچھے اس کے چمکیلے دانت دکھائی دیئے۔ شانتا صبح صبح مندر میں بیٹھی بڑی ترو تازہ اور شگفتہ لگ رہی تھی۔ اس کے کپڑوں سے اگربتیوں کی طرح ہلکی ہلکی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ میرے بہت مجبور کرنے پر شانتا میرے ساتھ مندر سے باہر نکل آئی۔ سنہری دھوپ خوب نکلی ہوئی تھی۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ گرم دھوپ میں شانتا کا گندمی رنگ چہرہ سرخ ہو کر چمکنے لگا تھا۔ براؤن ہونٹوں پر سانولے آلوچوں کا گمان ہو رہا تھا۔ ہم دونوں ایک جگہ کھیت کے کنارے درختوں کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گئے۔

سامنے کھیتوں میں سرسوں پھولی ہوئی تھی۔ سبز سبز ڈنٹھلوں پر زرد زرد سرسوں کے پھول کھل رہے تھے۔ یہ پھول جنوری کی خوشگوار دھوپ میں بڑے بھلے لگ رہے تھے۔ میں نے شانتا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔ یہاں دور دور تک کوئی بھی انسان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سامنے کی طرف سے سرسوں کے کھیتوں نے اور پیچھے درختوں نے ہمیں دنیا والوں کی نظروں سے چھپا رکھا تھا۔

"شانتا! میں تم سے اسی طرح پیار کرتا ہوں جس طرح کرشن اپنی رادھا سے پریم کرتا تھا"

"کرشن جی تو دوسری گوپیوں سے بھی پیار کرتے تھے"

"اب یہ تم جانو۔۔۔ تمہارا ہی کرشن تھا اور تمہاری ہی گوپیاں تھیں۔ میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ کرشن صرف رادھا سے پیار کرتا تھا۔ یا اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو صرف رادھا سے ہی پیار کرتا۔"

"تو کیا تم سچ مچ مجھ سے اتنا ہی پریم کرتے ہو؟"

"میں تمہیں کیسے وشواش دلاؤں شانتا؟ تم کہو تو میں یہ سرسوں کا کھیت کاٹ کر رکھ دوں؟ ان درختوں کو تہ تیغ کر دوں؟"

"نہ بابا ایسا نہ کرنا۔ نہیں تو لوگ تمہارے ساتھ مجھے بھی پکڑ کر لے جائیں گے۔ مجھے وشواش ہے۔ مگر بھٹ جی! تمہارا پریم مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"کیوں؟ کیا میرے پریم میں نمک کم ہوتا ہے؟"

"بات یہ ہے کہ تم شریر سے پیار کرتے ہو اور میں آتما سے۔"

"شریر سے کیا یعنی شرارت سے پیار کرتا ہوں؟"

شانتا نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں نہیں شرارت نہیں شریر کا مطلب بدن ہوتا ہے۔"

"تو کیا تم بدن نہیں ہو؟ تمہارا بدن تمہاری آتما کا حصہ نہیں ہے شانتا؟ اگر تمہارا بدن نہ ہوتا تو میں تمہاری آتما کو کہاں تلاش کرتا پھرتا؟"

"میری آتما کا میرے شریر سے کوئی تعلق نہیں۔ میری آتما تو شریر کے بندی خانے میں بند ہے۔ یہ تو مایا ہے۔ دھوکا ہے۔۔۔۔"

"ہری اوم! ہری اوم!۔۔۔۔۔"

میں نے فرط عقیدت سے جھوم کر کہا۔

"شانتا دیوی تو بھگوان کی بھگتنی ہے۔ تو ستی ساوتری ہے۔ تو میرا بائی ہے رام رام ۔۔۔۔۔ تو کالی ماتا ہے تو مسٹر بھگت کبیر کی چھوٹی بھانجی ہے۔۔۔۔۔"

شانتا ہنس پڑی۔

"بھٹ جی بڑے شریر ہو تم۔"

"یعنی بڑا بدن والا ہوں۔"

شانتا کھل کھلا کر ہنس پڑی میں نے اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال دیا۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور پرے کھسکنے لگی۔

"یہاں کوئی دیکھ لے گا؟"

"یہاں سوائے ان درختوں اور سرسوں کے کھیت کے اور کوئی نہیں"

میں نے شانتا کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

"تم تو خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو۔"

"نہیں بھٹ جی! میں اپنی عزت سے ڈرتی ہوں۔"

"تم بڑی ڈرپوک ہو۔"

"لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

"یعنی سب خرگوشوں کی طرح ڈرپوک اور بزدل؟"

"میں ڈرپوک ضرور ہوں، بزدل نہیں ہوں۔"

"پھر پریم کرنے سے کیوں گھبراتی ہو؟"

"میں پریم سے نہیں پاپ سے گھبراتی ہوں۔"

"کون پاپی پاپ کرتا ہے شانتا؟"

میں نے شانتا کو اپنی گود میں بٹھلا لیا۔ شانتا میرے ساتھ لگ گئی۔ میں نے رام رام کا ورد کرتے ہوئے شانتا کو رام کر لیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ بھجنوں کے تقدس سے نہیں بلکہ جذبہ عشق کے خمار سے! اس کا بھرا بھرا جسم گرم ہو کر سخت ہونے لگا۔ دل ایک بار سخت ہو کر نرم ہونے لگا۔ ہم دونوں نے اپنا آپ ایک دوسرے کے حوالے کر دیا۔ شانتا کے ہونٹوں سے پکے ہوئے آلوچوں کی مہک اٹھ رہی تھی اور دھلا دھلایا گندمی بدن خمیری روٹی کی گرم خوشبو دے رہا تھا۔ میں بھوک سے نڈھال ہو کر اس خمیری روٹی کو سالن کے بغیر ہی مزے لے لے کر کھانے لگا۔ غریب کو جب روٹی ملے تو وہ پیٹ بھر کر کھاتا ہے۔ چنانچہ میں نے خوب پیٹ بھر کر خمیری روٹی کھائی اور ڈکار مار کر پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ شانتا سرسوں کے کھیت میں لیٹی نیم خوابیدہ سی تھی۔ سرسوں کے ڈنٹھل اس کے نیچے دب گئے تھے۔ دھوپ اس کے گندمی چہرے پر چمک رہی تھی۔ اس نے آنکھوں پر بازو رکھا ہوا تھا۔ اچانک اس نے اٹھ کر کپڑے درست کرتے ہوئے کہا۔

"ہائے بھٹ جی! بڑی دیر ہو گئی۔ ماتا جی کیا کہیں گی؟"

ہم دونوں کھیتوں میں سے جلدی جلدی گزرتے گزرتے شانتا کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ کچے راستے پر چلنے سے ہمارے پاؤں گرد میں اٹ گئے۔ شانتا کا رنگ نکھر گیا تھا۔ آنکھوں میں خمار سا ٹوٹ رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اسے میٹھی نیند سے اچانک جگا دیا ہو اور وہ بادل نخواستہ چلی جا رہی ہو۔ میں نے شانتا کا ہاتھ تھام کر پوچھا کہ وہ مجھے

پھر کب ملے گی۔ اس نے میرا ہاتھ تو دبایا اور پھر جھٹک کر بولی۔

"ہٹو میں نہیں بولتی تم سے؟"

"کیوں؟"

"تم بڑے برے ہو۔"

"برے لوگ بڑے اچھے ہوتے ہیں شانتا۔"

اب ہم نہر کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ جب پل آیا تو شانتا اتنا کہہ کر "اب میں چلی" جلدی سے مجھ سے الگ ہو گئی اور پل اتر کر دوسری طرف والی آبادی کی گلیوں میں داخل ہو گئی۔ جب تک وہ میری نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی میں اسے نہر کے پل پر کھڑا دیکھتا رہا۔ جب وہ نگاہوں سے غائب ہو گئی تو میں نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور شہر کی جانب روانہ ہو گیا۔

طارق اقبال پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

21

وسط جنوری کی ایک ابر آلود رات تھی۔

میں شام ہی سے لاہور سے آئے ہوئے تین افسروں کے بلانے پر ان کی کوٹھی کے کمرے میں بیٹھا ان کے رجسٹروں میں اپنے رجسٹر سے نقل کر رہا تھا۔ میں نے کھانا بھی وہیں کھایا تھا۔ باہر خوب بارش ہو رہی تھی۔ اتنی شدید سردی پڑ رہی تھی اور اتنی تیز ہوا چل رہی تھی کہ باہر نکلتے ہوئے آدمی برف ہو کر رہ جاتا۔ تیسرا افسر پال اپنے کمرے میں کھانا کھانے کے بعد سو رہا تھا۔ دونوں افسر ساتھ والے کمرے میں بیٹھے شراب کے جام لنڈھا رہے تھے۔ وہ بڑی اعلیٰ قسم کی شراب پی رہے تھے۔ کوئی گھنٹہ بھر سے پی رہے تھے۔ مگر نہ تو ڈرائیور یوسی کی طرح لڑکھڑاتے تھے نہ واہی تباہی بکتے تھے۔ ان کے چہرے سرخ ہو کر چمکنے لگے تھے۔ آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ ایک افسر گاہے گاہے میرے کمرے میں آ کر مجھے تھپکی دے جاتا۔

"بٹ جی کام کرتے جاؤ۔ تم بھی آج یہیں سو جانا۔ باہر تو موسلا دھار مینہ پڑ رہا ہے۔"

پھر وہ دوسرے افسر کے پاس جا کر کہتا۔

"وہ کمینہ ابھی تک کیوں نہیں آیا؟"

دوسرے کمرے سے بار بار کھڑکی کھولنے اور بند کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جیسے وہ کسی کی راہ دیکھ رہے ہوں۔ میں تھک گیا تھا اور اس کام سے سخت بیزار ہو گیا تھا۔ دل کہتا تھا کہ یہیں دری پر کمبل لے کر پڑے رہو۔ لیکن مجبوراً مجھے کام کرنا پڑ رہا تھا۔ باہر بارش دل کی آواز کو گرما رہی تھی اور نیند طاری کر رہی تھی۔ اچانک باہر کسی کار کے آ کر رکنے کی آواز سنائی دی۔ ساتھ والے کمرے میں ایک افسر بولا۔

"آ گیا کمینہ۔"

میں نے جلدی سے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا کر باہر دیکھا۔ برآمدہ میں مدھم سی بتی جل رہی تھی۔ برآمدے کے ساتھ ہی کالے رنگ کی ایک گاڑی کھڑی تھی جس کی چھت پر

بارش کے قطرے چھینٹیں اڑا رہے تھے۔ دونوں افسر گرم گاؤن پہن کر باہر برآمدے میں آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ کار کا دروازہ کھلا اور وہی ہوائی اڈے والے اوورسیئر کا ملازم باہر نکلا اور افسروں کو سلام کر کے پھر کار کی کھڑکی پر جھک گیا۔

"آجاؤ باہر۔"

اندر سے کوئی بھی نہ نکلا۔

"چلو اب نخرے نہ کرو اور باہر آجاؤ۔"

کیا دیکھتا ہوں کہ اندر سے وہی مزدور لڑکی بملا گھگری پہنے، بھورے رنگ کے خانے دار کمبل میں لپٹی لپٹائی باہر نکلی اور سر جھکا کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ دونوں افسر اب اندر جا چکے تھے۔ انہوں نے اندر جا کر شراب کی ایک ایک مزید چسکی لگائی۔ اوورسیئر کے ملازم نے بملا کا ہاتھ تھام لیا اور اسے ساتھ لے کر اندر کمرے میں آ گیا۔ کچھ دیر تک مجھے ملازم کی گفتگو کی آواز سنائی دیتی رہی۔ پھر وہ دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ کار سٹارٹ ہوئی اور کوٹھی سے باہر نکل گئی۔ اب چاروں طرف سناٹا طاری ہو گیا۔ اچانک ایک افسر کمرے میں آیا اور چونک کر بولا۔

"ارے ارشد! خیال ہی نہیں آیا۔ یہ بٹ بیچارہ تو یہیں رہ گیا۔ اسے گاڑی میں واپس شہر آسانی سے بھیج سکتے تھے۔"

دوسری طرف سے افسر نے کہا۔

"ڈونٹ وری ڈیئر۔ اسے یہیں سلا دو۔"

"بٹ تم اس صوفے پر سو جاؤ۔ یہاں سے دونوں کمبل اٹھا لو۔"

میں نے یوں ظاہر کیا جیسے مجھے کسی بات کی کچھ خبر نہیں۔ ایک بناوٹی جمائی لے کر کرسی پر سے کمبل اٹھائے اور صوفے پر جا کر لیٹ گیا۔ افسر نے جو ذرا ذرا لڑکھڑا رہا تھا۔ کمرے کی بتی گل کر دی اور دوسری طرف سے دروازے کی چٹخنی لگا دی۔ میرے کمرے میں پہلے تو اندھیرا چھا گیا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ تاریکی ساتھ والے کمرے کے روشندان سے آتی ہوئی روشنی سے دھیمے دھیمے اجلی سی ہو گئی۔ کچھ دیر تک میں اپنے صوفے پر چپ چاپ بے حس و حرکت پڑا رہا اور بملا کے بارے سوچتا رہا۔ آخر یہ لوگ اسے یہاں کیوں لے آئے؟ اگر خواجہ بینڈک یا گامی باکسر کو معلوم ہو جائے تو وہ غصے میں پاگل ہو کر ان دونوں افسروں کو اٹھا

کر باہر کھیتوں میں پھینک دیں۔ مگر کوٹھیوں کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کے اندر انسان چاہے جو کچھ بھی کرتا رہے۔ کسی کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوتی۔

ساتھ والے کمرے میں بھی خاموشی طاری تھی۔ پھر گلاس میں شراب انڈیلنے کی آواز سنائی دی۔ باہر بارش بہت ہلکی ہو گئی تھی۔ مگر تیز ہوا میں درختوں کی شائیں شائیں جاری تھی۔ میرے دل میں روشندان کے ساتھ لگ کر دوسری طرف تماشہ دیکھنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ میں اس خواہش کو کوشش کے باوجود نہ روک سکا۔ میں آہستہ سے صوفے پر سے اٹھا۔ دروازے کے پاس گیا۔ میز پر ایک کرسی رکھی اور اس کرسی پر چڑھ کر روشندان کے ایک جگہ سے ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے دوسری طرف جھانکنے لگا۔

کمرے میں دو ہیٹر جل رہے تھے اور سرخ ہو کر انگارہ بنے ہوئے تھے۔ دونوں افسر بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ بملا ان کے درمیان چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ایک افسر نے شراب گلاس میں ڈال کر اس کی طرف بڑھایا۔

"اسے پی لو۔ یہ ساری سردی دور کر دے گا۔"

بملا نے ہاتھ سے گلاس پرے کر دیا۔ دوسرے افسر نے بملا کا منہ چوم لیا۔ اسے مجبور کیا جانے لگا کہ وہ شراب پیئے۔ بملا تلملائی۔ مگر دونوں افسروں نے مل کر شراب کا آدھا گلاس اس کے حلق میں انڈیل دیا۔ بملا نے کمبل اتار رکھا تھا۔ وہ صرف کالی انگیا اور سرخ گھگریا میں ہی تھی۔ بال سر پر پھولے ہوئے تھے۔ بازو کہنیوں تک ننگے تھے۔ بملا سر پکڑ بیٹھ گئی اور رونے لگی۔ ایک افسر نے اس کے گرد بانہیں ڈال دیں۔

"ڈونٹ ویپ مائی ڈارلنگ!"

"مت رو پیاری ہم تو تم سے محبت کریں گے۔ ہم سے کیوں ڈرتی ہو؟"

بملا روتی رہی۔ افسروں نے بملا کو تسلی دیتے دیتے ایک بار پھر پکڑ کر اس کے حلق میں شراب کا دوسرا جام بھی انڈیل دیا۔ شاید یہ جام تلخ تھا۔ بملا کو کھانسی شروع ہو گئی اسے جلدی سے پانی پلایا گیا اور کھانے کو سموسہ پیش کیا گیا۔ بملا نے سر صوفے کی پشت سے لگا دیا اور دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لئے۔ افسر سگریٹ پیتے رہے اور بملا کے جسم پر پیار سے ہاتھ پھیرتے رہے۔ باہر ایک دم بارش تیز ہو گئی۔

انہوں نے ایک اور گلاس میں شراب ڈال کر بملا کے حلق میں انڈیل دی۔ اب بملا

نے اپنا جسم چھوڑنا شروع کر دیا۔ وہ بے حس سی ہو کر گر گئی۔ اس نے دونوں بازو صوفے پر پھیلا دیئے۔ افسروں نے معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکرائے انہوں نے بملا کے کپڑے اتارنے شروع کر دیئے۔ اس مجبور عورت کو بالکل برہنہ کر کے انہوں نے اسے میز پر گدیلا بچھا کر لٹا دیا اور خود سگریٹ ہاتھوں میں لے کر اس پر جھک کر اس کے جسم کا ایک ڈاکٹر کی طرح جائزہ لینے لگے۔ بملا کا بازو پکڑ کر اٹھا لیا۔ بغل کے بالوں کو کھینچ کھینچ کر دیکھتے۔ کبھی ٹانگ کو اٹھا کر پھر میز پر رکھ دیتے۔ ایک افسر نے اپنا منہ بے ڈر ہو کر اس کے منہ پر رکھ دیا۔ دوسرے نے اپنا منہ اس کے پیٹ پر رکھ دیا۔ اس قسم کی مذموم اور گھناؤنی حرکات کے بعد وہ خود بھی عریاں ہو گئے اور کھانے والی بڑی میز پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور سگریٹ کے کش لگا لگا کر جھومنے اور مجبور و بے کس عورت کی جسم کا پوسٹ مارٹم کرنے لگے۔

اس کے بعد جو کچھ انہوں نے کیا وہ مجھ سے نہ دیکھا گیا۔ میں کرسی پر سے نیچے اُتر آیا۔ میز کرسی اپنی جگہ رکھی خود صوفے پر آ کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے بملا کے ماں باپ کے بارے میں سوچنے لگا۔ جنہوں نے جانے کس مجبوری کے تحت اپنی عزت کو اس طوفانی رات میں ان درندوں کے حوالے کر دیا تھا۔ میں نے سوچا جب صبح بملا کو ہوش آئے گا اور وہ اپنا خون آلود ادھڑا ہوا ناموس دیکھے گی تو اسے کتنا صدمہ نہیں ہو گا۔ مجھے یہ دونوں خوش باش، نازک مزاج، خوش وضع، مہذب اور پڑھے لکھے آدمی سوروں سے زیادہ گندے، گھناؤنے اور بے غیرت محسوس ہونے لگے۔ میرا دل چاہا کہ وہاں سے ابھی نکل کر اپنے ڈیرے میں ان لوگوں میں چلا جاؤں۔ جو بدصورت، بدوضع اور بدلگام تھے لیکن بے غیرت اور بے حیا نہیں تھے۔ لیکن باہر بارش ہو رہی تھی۔ سردیوں کی رات بارش اور میرا ڈیرہ وہاں سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ مگر میں ساری رات وہاں بے چین اور پریشان رہا۔ صرف گھنٹہ بھر کے لئے سویا ہوں گا۔ پچھلے پہر میری آنکھ کھل گئی۔

میں نے روشن دان میں سے جھانک کر دوسرے کمرے میں دیکھا۔ بتی بدستور جل رہی تھی۔ ہیٹر بھی سرخ ہو رہے تھے۔ تین ننگی لاشیں یوں پڑی تھیں جیسے میدان جنگ میں دشمن کے نیزوں نے ان کے سینے چھلنی کر دیئے ہوں۔ ایک افسر کی شراب کے نشے میں دھت لاش قالین پر پڑی تھی۔ دوسرے افسر کی لاش پلنگ پر پڑی تھی اور بملا کی لاش اس

کے پاس اوندھے منہ پڑی تھی۔ اس ڈراؤنے اور عبرت انگیز منظر کو دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ باہر بارش رک گئی اور مشرق کی طرف بادلوں میں صبح کی سپیدی پھوٹ رہی تھی۔ بند کھڑکی کے شیشوں میں رات بھر کے بھیگے ہوئے درختوں کے خاکے دکھائی دینے لگے تھے۔ میں وہاں سے بھاگ نکلنا چاہتا تھا۔ اس گناہ کی دلدل میں میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ مگر دروازہ دوسری طرف سے بند تھا۔ سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں تھا کہ کھڑکی سے باہر کودا جائے۔

چنانچہ میں نے کوٹ پہنا، بوٹ پہنے، سر کے گرد مفلر لپیٹا، کھڑکی کا پردہ ہٹا کر پٹ کھولا اور باہر گیلی زمین پر چھلانگ لگا دی۔ صبح کی تازہ ہوا میری پیشانی سے مس ہوئی اور میرے جسم میں پاکیزگی، تروتازگی اور شگفتگی کی لہر دوڑ گئی۔ صبح کتنی عظیم ہے! نیچر کس قدر حیرت انگیز اور پاکیزہ ہے۔ ہوا بڑی لطیف تھی اور کسی نومولود بچے کے سانس کی طرح پاکیزہ تھی۔ میں نے کوٹھی کے باغ میں کھڑے ہو کر دو تین لمبے سانس لئے اور کوٹھی سے باہر نکل آیا اور پکی سڑک پر اپنے ڈیرے کی طرف چل پڑا۔

اپنی کوٹھڑی میں پہنچ کر میں نے کوٹ اور جوتے اتارے اور بستر پر گرتے ہی سو گیا۔ تمام ڈرائیور اپنے اپنے لحافوں میں بے سدھ ہو کر سو رہے تھے۔ کوٹھڑی کی گرم فضا نے میرے ٹھٹھرے ہوئے اعضاء کو گرم کمبل کی طرح اپنی آغوش میں لے لیا۔ میں دن چڑھے تک سویا رہا۔ کوئی ساڑھے دس بجے پٹرول پمپ پر سردار خاں سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اسے ایک طرف لے جا کر کوٹھی میں گذری ہوئی رات کا پورا قصہ سنا دیا۔ اس نے سن کر سر جھکا لیا اور بولا۔

"ہم کیا کر سکتے ہیں بٹ جی؟ یہ لوگ بس ایسے ہوتے ہیں۔ نوکروں کو ان کے لئے سب بے حیائی کے کام کرنے ہی پڑتے ہیں۔ اب تم ایسا کرنا کہ اس بات کا کسی سے بھی ذکر مت کرنا۔ تم یہ سمجھ لو کہ تم نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ یہ میری تمہیں ہدایت ہے۔"

"ایسا ہی ہوگا۔"

میں نے کسی سے اس کا ذکر نہ کیا۔ حالانکہ میرا دل چاہتا تھا کہ میں گامی باکسر اور خواجہ بھنڈک کو سارے چشم دید واقعات سنا دوں اور پھر جب وہ ان دونوں افسروں کی ٹھکائی کریں تو میرا دل ٹھنڈا ہو جائے۔ لیکن سردار خان کو وعدہ دے چکا تھا۔ اور مجھے اپنے وعدے اور

سردار خاں کا پاس خاطر کرنا تھا۔ لیکن میں نے بھی سردار خاں کو اس بات کی یقین دہانی کروا لی کہ مجھے کسی حالت میں بھی پھر کبھی ان افسروں کی کوٹھی پر نہ بھیجے گا۔ مگر میں نے کیول سیٹھی کو جا کر سارا ماجرا سنا دیا۔ وہ بھی اس بے کس و مجبور لڑکی کی قسمت پر افسوس کرنے لگا۔

غریبی اس دنیا کی سب سے بڑی لعنت ہے بٹ جی! غریبی سب برائیوں کی ماں ہے۔ غریبی انسان کو اپنی عزت بیچنے پر بھی مجبور کر دیتی ہے۔

"کیا اس دنیا کو غریبی سے نجات نہیں دلائی جا سکتی؟"

نجات دلانی ضرور چاہیے۔ مگر کیسے؟ یہ میں نہیں جانتا۔ یہ کام تو ہم پر حکومت کرنے والوں کا ہے۔ ہمارا کام تو یہ ہے کہ ایمانداری سے کام کرتے چلے جائیں اور کبھی اپنے کسی فعل سے دوسرے کا دل نہ دکھائیں۔"

میرا دل بڑا اداس ہو گیا اور مجھے انسان کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔

طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

13

ایک روز شام کو میں ہوٹل میں کھانا کھا کر واپس ڈیرے پر آیا تو خواجہ مینڈک باہر پھدکتا پھر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر آنکھیں مچکا کر بولا۔

"بٹ جی آپ کا معشوق اندر بیٹھا ہے۔"

میں نے حیران ہو کر اس طرف دیکھا۔ اس نے خچر کی طرح ہنہنا کر کہا۔

"بٹ جی بکل میں ہی ریوڑی توڑ ڈالی؟"

میں اندر گیا تو دیکھا کہ کرشید سفید برقعہ اوڑھے میرے پلنگ پر بیٹھی ہے اور گامی باکسر اس کے سامنے چائے کی پیالی رکھ کر کہہ رہا ہے۔

"آپ اسے اپنا گھر ہی سمجھیں۔ بٹ جی ابھی آتے ہوں گے۔"

خواجہ مینڈک بھی اندر آ گیا۔ راجگورو بچھونے پر اکڑوں بیٹھا آگ تاپ رہا تھا۔ مدقوق ڈرائیور منحنی گردن اٹھائے لحاف میں سے پر اشتیاق نظروں سے باہر دیکھ رہا تھا میں نے کرشید کو ساتھ لیا اور باہر آ گیا۔

"میں تو آدھ گھنٹے سے تیرا انتظار کر رہی ہوں جانی۔"

میں نے جھنجلا کر کہا۔

"تم یہاں کیوں آ گئیں۔"

کرشید نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی، میں نے ساری تیاری مکمل کر لی ہے۔"

اس نے مجھے زیورات سے بھری ہوئی پوٹلی دکھلائی۔

"میں سارا زیور ساتھ لے آئی ہوں۔"

"میں کیا کروں پھر؟"

میں نے اس کا ہاتھ پرے کرتے ہوئے کہا۔

میں ایسا نہیں کر سکتا کرشید۔ تم نے مجھے غلط سمجھا ہے۔ جاؤ اپنے گھر جاؤ اور اپنے خاوند کے ساتھ باقی زندگی بسر کرنے کی کوشش کرو۔"

کرشید نے آنکھیں سکیڑ کر کہا۔

پھر تم میرے پاس رات کو کیوں آجاتے تھے؟ کیا اس وقت تمہیں میرے خاوند کا خیال نہیں آتا تھا؟"

آتا تھا مگر جب بیوی اپنے خاوند کو دھوکا دے کر کسی مرد کے سامنے ننگی ہو جائے تو پھر وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اس دلدل میں تم نے مجھے گھسیٹا ہے۔ میں نے نہیں۔"

کرشید رونے لگی۔

"مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی جانی۔ تم نے میرا دل توڑ دیا ہے۔"

میں نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔

"کسی کے ساتھ بھاگ کر نکل جانے سے بہتر ہے کرشید کہ تم اپنے خاوند سے طلاق لے کر کسی دوسرے سے شادی کر لو۔"

"وہ مجھے کبھی طلاق نہیں دے گا۔"

"تم عدالت میں درخواست دے دو کہ تم اس سے طلاق چاہتی ہو کیونکہ وہ بچے پیدا کرنے کے نااہل ہے۔ عدالت تمہارے حق میں فیصلہ دے گی۔"

کرشید نے برقعہ اوڑھتے ہوئے کہا۔

"اگر تم میرے ساتھ نہیں جاسکتے تو مجھے نصیحتیں بھی نہ کرو۔ تم کنارے پر کھڑے ہو اور میں طوفان کے اندر ہوں۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔"

میں اسے چھوڑنے سڑک تک گیا۔ رات کا اندھیرا پھیل گیا اور سردی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ کرشید چلی گئی اور میں واپس کوٹھڑی میں آگیا۔ ڈرائیور مجھے مذاق کرنے لگے۔ خواجہ بولا۔

"بھئی تم بٹ جی کو کیوں ایسا کہتے ہو۔ کیا ان کا جی نہیں کرتا ریوڑیاں کھانے کو؟ کھاؤ بادشاہو خوب ریوڑیاں کھاؤ۔"

میں چائے پینے وہاں سے باہر نکل آیا اور ہوٹل میں آکر بیٹھا رہا۔ رات کو اس وقت ڈیرے میں آیا جب ڈرائیور خراٹے لے رہے تھے۔ کوئی چار روز بعد جب ایک دن صبح کو میں پٹرول پمپ پر گیا تو کرشید کے مکان کے باہر پولیس کھڑی تھی اور کچھ لوگ بھی جمع تھے۔ جس کا ادھیڑ عمر کا گنجا خاوند تھانیدار کو کچھ لکھوا رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس کی بیوی گھر کا سارا

سامان سونا اور نقدی لے کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ آخر کرشید نے اپنے نامرد خاوند سے چھٹکارا حاصل کر لیا تھا مگر وہ گڑھے سے نکل کر کنویں میں گر گئی تھی کیونکہ ایسی عورتوں کی آخری منزل عام طور پر رنڈیوں کا بازار ہوتی ہے اور ہوا بھی ایسا۔۔۔ کوئی دس گیارہ سال بعد جبکہ پاکستان معرض وجود میں آ چکا تھا۔ میں نے لاہور کے رنڈیوں کے بازار میں کرشید کو دیکھا۔ وہ پہلے سے زیادہ دبلی ہو گئی تھی۔ رنگ زیادہ سانولا ہو گیا تھا۔ چہرے پر چھائیوں کے ہلکے ہلکے داغ تھے۔ وہ بوڑھی عورت دکھائی دے رہی تھی۔ جب اس نے مجھے پہچانا تو میرے گلے سے لگ کر زار و قطار رونے لگی۔ مگر اس وقت کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

میں نے کیول سیٹھی کو اس کی دکان پر جا کر بتایا کہ کرشید کسی کے ساتھ سارا زیور لے کر بھاگ گئی ہے۔ کیول نے سنجیدگی سے کہا۔

"ایسے مرد جب محض اپنی ہوس پوری کرنے کے لئے شادیاں کرتے ہوں تو ان کی بیویاں یہی کام کرتی ہیں جو کرشید نے کیا۔ کرشید کے گناہ کی ذمہ داری اس کے خاوند پر بھی عائد ہوتی ہے۔"

"میرا خیال ہے وہ ضرور کہیں نہ کہیں پکڑے جائیں گے۔"

پکڑے نہیں جائیں گے تو وہ شخص کرشید کا سارا مال ہضم کرنے کے بعد اسے کسی کے ہاتھ بیچ کر چلتا بنے گا۔"

ہم باتیں کر رہے تھے کہ ایک نسواری سیدھے برقعے والی لڑکی آئی اور بڑی مترنم آواز میں بولی۔

"پیازی رنگ کے ربن ہوں گے آپ کے پاس؟"

"ہاں جی۔"

کیول اس لڑکی کو ربن نکال کر دکھانے لگا۔ اور میں اس لڑکی کو دیکھنے لگا۔ اس نے نقاب اٹھا رکھا تھا۔ چہرہ گول، سانولا اور دلکش و نازک تھا۔ ناک میں سرخ نگ والا کیل تھا۔ کانوں میں سنہری بندے تھے۔ آنکھیں بڑی خوب صورت اور گرم گرم تھیں۔ بازو صحت مند اور بھرپور تھے۔ لڑکی نے بھی ربن دیکھتے دیکھتے دو تین بار نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور کچھ شرما کر مسکرا کر نظریں جھکا لیں۔ جب وہ جانے لگی تو اس نے ایک بار پھر میری طرف گھری نگاہوں سے دیکھا اور جیسے اپنے پیچھے پیچھے آنے کی کھلی دعوت دی۔ لیکن میں کچھوے کی طرح

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ
ڈاٹ کام

سست ہو کر گرم شال اوڑھے وہاں بیٹھا رہا۔ کیول نے مسکرا کر کہا۔

''میں دعوے سے کہتا ہوں اگر تم اس چوک تک اس کے ساتھ جاؤ تو وہ تمہاری ہو جائے گی۔''

میں نے کندھے جھٹک کر کہا۔

''چھوڑ یار ان عورتوں کے ایک ہی مسئلے ہوتے ہیں۔ سب عورتیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ میں تو ان سے تنگ آ گیا ہوں۔ چار دن اچھے گزارتی ہیں پھر سر پر سوار ہو جاتی ہیں اور زندگی اجیران کر دیتی ہیں۔ ان شریف زادیوں سے رنڈیاں بہتر ہیں جو کبھی کچھ نہیں پوچھتیں اور تمہارے ساتھ بڑے آرام سے لیٹ جاتی ہیں اور ہنسی خوشی جدا ہو جاتی ہیں۔ ڈرائیور اکا ٹھیک کہتا تھا۔ ہم ایسے مردوں کے لئے بدمعاش عورت دنیا کا بہترین تحفہ ہے۔ ہمیں تو شریف عورتوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں تکنا چاہیئے۔ شریف عورتیں ایسی بے رس، خشک، مولوی، اور ٹھنڈی ہوتی ہیں کہ آدمی کی روح تک مر جاتی ہے-----''

تینوں افسر سرگودھا سے واپس چلے گئے۔ جاتے ہوئے انہوں نے رجسٹر میں لکھ دیا کہ کام بڑا تسلی بخش اور جانفشانی سے ہو رہا ہے اور اسی طرح کام ہوتا رہا تو سرکار کی رقم میں بچت بھی ہو گی اور ہوائی اڈہ بھی وقت سے پہلے تیار ہو جائے گا۔ سردار خاں ان تعریفی جملوں کو جگہ جگہ سناتا پھرا۔ لیکن اس مزدور لڑکی بملا کو کسی نے نہ جا کر بتایا کہ تیری وجہ سے سرکاری رقم میں بچت بھی ہو گئی ہے اور ہوائی اڈہ بھی وقت سے پہلے تیار ہو رہا ہے۔ میں نے ایک روز ہوائی اڈے پر جا کر دیکھا۔ بملا ٹوکری ڈھو رہی تھی اور کسی بات پر اوورسیز سے بات کر رہی تھی۔ آخر کتے بلیاں کھانے والی کی اولاد ہے ناں! ان لوگوں میں آخر غیرت کیوں نہیں ہوتی؟ کیا غریبی غیرت کو بھی ختم کر دیتی ہے!

ہوائی اڈے کی تعمیر قریب قریب ختم ہو رہی تھی۔ چنانچہ جنوری کے آخیر میں ہماری چھ لاریوں کو واپس امرتسر بھیج دیا گیا۔ ڈرائیوروں کا دوسرا ڈیرا اٹھ گیا۔ صرف ہمارے ڈیرے والے ڈرائیور باقی رہ گئے ہیں۔ آخر ان لوگوں کا کام بھی ختم ہو گیا۔ واپسی کی تیاریاں شروع ہو گئیں کوچ کرنے سے ایک روز پہلے میں شانتا کے سکول گیا۔ میں اس سیدھی سادھی اور پیاری لڑکی کو جانے سے پہلے ضرور ملنا چاہتا تھا۔ جب وہ سکول سے باہر نکلی تو میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ شہر کی گنجان آبادی سے باہر جا کر میں نے اسے بتایا کہ کل

رات کو اس شہر چھوڑ رہا ہوں۔

شانتا نے میری طرف دیکھا۔ س کی آنکھوں میں ایک دم غم جھلکنے لگا۔

"سچ مچ کل جا رہے ہو تم؟"

"ہاں شانتا۔"

"پھر کبھی نہیں آؤ گے ہمارے شہر؟"

میں تو یہاں سے جانا نہیں چاہتا۔ مگر مجبوری ہے جانا ہی پڑے گا۔ پھر میں تمہیں ملنے آؤں گا۔"

"کون آتا ہے ملنے پھر!"

ہم باتیں کرتے نہر کے پل پر پہنچ گئے۔ یہاں سے شانتا کو اپنے گھر کی طرف مڑنا تھا۔ یہ جگہ ایسی تھی کہ وہ کھڑی ہو کر میرے الوداعی جملوں کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ جتنی باتیں تھیں اتنے ہی لوگ دوسری طرف آ جا رہے تھے۔ شانتا نے آخری بار غمگین آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ہاتھ جوڑ کر "نمستے" کہا پل کی دوسری طرف اتر گئی۔ میں اسے جاتے دیکھتا رہا۔ آبادی کے مکانوں میں گم ہونے سے پہلے اس نے بھی مڑ کر میری طرف دیکھا۔ یہ اس کے آخری درشن تھے۔ اس کے بعد میں شانتا کو نہ دیکھ سکا۔ پاکستان بننے کے بعد ایک بار سرگودھا گیا تو میں نے شانتا کے مکان کی جگہ سوائے ملبے کے ڈھیر کے اور کچھ نہ دیکھا۔ کیول سیٹھی کی دکان میں ایک مولوی صاحب بیٹھے کیول سیٹھی کا سامان فروخت کر رہے تھے۔ جب تک شانتا کا مکان جل کر ملبے کا ڈھیر نہیں بن گیا اور کیول سیٹھی کی دکان پر مولوی صاحب نے قبضہ نہیں جما لیا میں سرگودھا نہ جا سکا۔ دوسرے روز شام کو میں کیول سے ملنے گیا تو اس نے مجھے ایک سویٹر دے کر کہا۔

"شانتا دے گئی تھی۔"

سویٹر کا رنگ سرخ تھا۔ شانتا کی بندیا کی طرح میری آنکھیں بھر آئیں۔ سویٹر میں سے ہلکی ہلکی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ میں نے سویٹر لے لیا اور کیول کو جیب میں سے نکال کر رولڈ گولڈ کی چوڑیوں کی ایک جوڑی دی جو میں شانتا کے لئے خرید کر لایا تھا۔ کیول نے الماری میں رکھ لی۔

"شانتا کا میری طرف سے شکریہ ادا کرنا اور کہنا کہ میں اسے کبھی نہ بھول سکوں گا اور

تمہیں بھی کیول میں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔"

کیول نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ وہ مجھ سے بغل گیر ہو کر ملا۔ اور میں چپکے سے اس کا ہاتھ چھوڑ کر واپس آ گیا۔ اسی رات ہماری باقی ماندہ لاریاں بھی واپس امرتسر کی طرف روانہ ہو گئیں۔ میں اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ رات کا اندھیرا کھیتوں اور پہاڑیوں کے دامنوں میں پھیل رہا تھا اور میرے ذہن میں شانتا اور کیول کی شکلیں پھر رہی تھیں۔ جانے یہ لوگ آج کہاں ہونگے؟ اس بات کو ہوئے آج بیس سال گزر گئے ہیں۔ زمانہ بہت آگے نکل گیا ہے۔ کئی انقلاب آ چکے ہیں۔ شانتا کی یقیناً شادی ہو چکی ہو گی، اس کے بچے ہوں گے۔ کیا میں اسے یاد آ رہا ہوں؟ ہندو عورتیں بڑی پریم کرنے والی اور باوفا ہوتی ہیں۔ شانتا نے مجھے ضرور یاد رکھا ہوگا۔ وہ اپنے بچوں کو سکول بھیج کر جب گھر میں اکیلی ہوتی ہو گی تو کبھی کبھی اسے لڑکے کا ضرور خیال آتا ہوگا۔ جو اس کے وطن کی نہر کے کنارے اس کے ساتھ ساتھ جایا کرتا تھا۔ جب وہ اسکول سے گھر واپس آیا کرتی تھی تو وہ ریلوے پھاٹک پر اس کا انتظار کیا کرتا تھا لیکن۔۔۔۔۔۔ لیکن کیا جانے شانتا فسادات کے شعلوں کی نذر ہو گئی ہو؟ نہیں نہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ کبھی نہیں ہو سکتا۔

اے حمید

طارق اقبال پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

محمد طارق اقبال
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام